بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تحریک ادب

شمارہ، مارچ -2025 جلد نمبر 18
Tahreek-e-adab vol-18, issue-87 March 2025

Editor مدیر
جاوید انور (ڈاکٹر جاوید احمد) **Jawed Anwar** (Dr.Jawed Ahmad)
cell-0091-9935957330

مجلس ادارت

Editorial board and Peer Review committee

پروفیسر صغیر افراہیم، سابق صدر شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

Prof. Sagheer Afrahim Ex.Chairman Dept.of Urdu A.M.U.

پروفیسر شہاب عنایت ملک، سابق صدر شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی

Prof.Shohab Inayat Malik HOD Urdu,Jammu University

ڈاکٹر شمس کمال انجم، صدر شعبۂ عربی، باباغلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی

Dr. Shams Kamal Anjum, H.O.D. Arabic, Baba Ghulam Shah Badshah University,Rajouri (J&K)

پروفیسر محفوظہ جان، صدر، شعبۂ کشمیری، کشمیر یونیورسٹی

Prof. Mahfooza Jaan(H.O.D.Kashmiri,Kashmir University)

پروفیسر شاہینہ رضوی (سابق صدر، شعبہ اردو، مہاتما گاندھی کاشی ودیا پیٹھ یونیورسٹی، وارانسی)

Prof.Shahina Rizvi (Ex.HOD,Urdu,MKVP University,VNS.)

ڈاکٹر دبیر احمد، صدر شعبہ اردو، مولانا آزاد پی۔ جی۔ کالج، کولکاتا

Dr. Dabeer Ahmad,H.O.D.Urdu, Maulana Azad P.G. College,Kolkata

ڈاکٹر احسان حسن، شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی

Dr.Ehasan Hasan,Dept of Urdu BHU Varanasi

مجلس مشاورت

Advisery Board and Peer Review committee

نجمہ عثمان،،اشتیاق احمد،عرفان عارف،ڈاکٹر چمن لال

Najma Usman (Surrey, United Kingdom)

Ishtiyaq Ahmad (General Secretary, Sir syed society Varanasi)

Irfan Arif (H.O.D.Dept. of Urdu,GDC Reasi University of Jammu,

Dr.Chaman Lal Bhagat (Asst. Prof.Dept. of Urdu,Jammu University,Jammu)

Name Tahreek-e-Adab(Urdu Monthly)

ISSN 2322-0341

Vol-18(18 جلد نمبر) Year of Publication 2025 سال اشاعت:

Issue March 2025،شمارہ 87۔مارچ شمارہ نمبر

Title name Artist : Anwar Jamal, Varanasi سرنامہ خطاط:انور جمال

Title cover Uzma Screen, Varanasi عظمیٰ اسکرین سرورق :

200/-Two Hundred rs. per copy دوسو روپے فی شمارہ :

زر سالانہ : دو ہزار روپے (رسالہ صرف رجسٹرڈ ڈاک سے ہی بھیجا جائے گا)

Annual Membership 2000/- rs. two Thousand Rupees

تاعمر خریداری (ہند): بیس ہزار روپے

Life Time: 20000/- Twenty Thousand rs.(only india)

چیک یا ڈرافٹ اور انٹرنیٹ بینکنگ کے ذریعے زر رفاقت یہاں ارسال کریں۔

Please send your subscription amount or donation through cheque,draft or internet banking on the following:

Jawed Ahmad IFSC SBIN0005382 A/C no. 33803738087
State Bank Of India,Branch-Shopping
centre(B.H.U.Campus.B.H.U.Varanasi-221005(U.P) India

اس شمارہ کی مشمولات میں اظہار کیے گئے خیالات ونظریات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

The content/idea expressed in any article of this journal is the sole responsibility of the concerned writer and this institution has nothing to do with it.

متنازعہ تحریر کے لیے صاحب قلم خود ذمہ دار ہے۔ تحریک ادب سے متعلق کوئی بھی قانونی چارہ جوئی صرف وارنسی کی عدالت میں ممکن ہوگی۔

Any legal matter pertaining to tahreek-e-adab will be possible only in the jurisdiction of Varanasi court.

جاوید انور مدیر تحریک ادب نے نیہا پرنٹنگ پریس، وارانسی سے شائع کرا اردو آشیانہ ۱٦۷، آفاق خان کا احاطہ، منڈواڈیہہ بازار، وارانسی سے تقسیم کیا۔

Jawed Anwar Editor Tahreek-e-Adab has got this journal published from Neha Printing Press, Varanasi and distribute it from Urdu Ashiana,167 Afaq Khan Ka Ahata,Manduadeeh Bazar,Varanasi-221103

فہرست

1۔بول کے لب آزاد ہیں تیرے (میں زندہ آدمی ہوں)	خالد حسین	5
2۔2024 کے فکشن اور فکشن تنقید کا جائزہ	پروفیسر اسلم جمشید پوری	22
3۔کیفی اعظمی (مونوگراف): ایک مطالعہ	فاروق جائسی	46
4۔"کڑی دھوپ کا سفر" تجزیہ اور تنقیدی نقطہ نظر	پروفیسر عفت آرا	60
5۔یاروں کا یار عمدہ نثر نگار پروفیسر صغیر افراہیم	شعیب نظام	71
6۔سحر انگیز افسانوں کا خالق: نیر مسعود	ڈاکٹر مسیح الزماں انصاری	83
7۔کیفی اعظمی (مونوگراف) کا تنقیدی محاکمہ	ابراہیم افسر	90
8۔تحریک ادب کی خدمات (افسانوں کے حوالے سے)	ڈاکٹر ساجد علی	100
9۔دبستان ہمالہ، دھنک اور فاروق مضطر	ڈاکٹر جاوید احمد	107
10۔فراق گورکھپوری کی نظم نگاری	شاہنواز انصاری	116
11۔سعادت حسن منٹو اور ریڈیائی ڈرامے	محمد یوسف میر	120

Bol ke lab azad hain tere (Main Zinda Aadmi hoon) by

Khalid Husain(Rtd,D.C)Jammu. cell-7006898585

خالد حسین (جموں)

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے

تم تکلّف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فراز　　　دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا (احمد فراز)

میرا نام کمل دیپ سنگھ ہے۔ میں نے جموں یونیورسٹی سے پنجابی ادب میں پی۔ایچ،ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے اور میرے مقالے کا عنوان تھا ''پنجابی کہانی کے بیانیے کا مطالعہ''۔ میں کالج لیکچرار ہوں اور پنجابی ادب پڑھاتا ہوں۔ میں نے قبلہ خالد حسین کو پڑھا ہے۔اُن کی کئی کہانیوں کا ترجمہ دیگر زبانوں میں کیا ہے۔ میں نے ان کی محاورے دار زبان اور ضرب المثل جملے اور شاعرانہ بیانیے کا لطف اُٹھایا ہے۔ میری رائے میں وہ پنجابی کے ایک ایسے افسانہ نگار تھے، جن کی دو سطریں پڑھ کر ہی قاری جان لیتا ہے کہ یہ خالد حسین کی تحریر ہے۔ چاہے اُن کا نام نہ بھی دیا گیا ہو۔ بابا خالد کی خودنوشت کو قارئین تک پہنچانے کے لئے میرا بھی یوگ دان ہے۔ اس خودنوشت کو جب میں ترتیب دے رہا تھا تو قبلہ خالد حسین کی بڑی بیٹی ڈاکٹر سمعیہ تبسم نے مجھے اُن کے کچھ غیر مطبوعہ خاکے اور انشائیے دیئے جو اُن کی الماریوں میں پڑے تھے جو خالد صاحب نے اپنے اُن دوستوں اور خیر خواہوں کے بارے میں لکھے تھے جو اُن کی زندگی میں اہمیت رکھتے تھے۔ یہ مختصر انشائیے بھی قبلہ خالد حسین کی آپ بیتی کا حصہ ہیں۔ ان میں سے کچھ انشائیے قارئین کی جانکاری کے لئے پیش خدمت ہیں:

شیخ غلام رسول: شیخ غلام رسول صاحب آئی۔اے۔ایس، ریٹائرڈ چیف سیکرٹری وممبر قانون ساز کونسل سے میری پہلی ملاقات تب ہوئی جب وہ ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ کے کمشنر تھے۔ اور 1971ء میں ایک کہانی ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے'' لکھنے پر انہوں نے مجھے معطل کر دیا تھا۔ اُس کہانی میں محکمہ قانون کے اُس وقت کے سیکریٹری غلام شاہ کی جنسی خرمستیوں کا ذکر تھا۔ مجھ پر الزام تھا کہ میں نے بغیر اجازت ایک فحش آرٹیکل لکھا ہے۔ جبکہ میرا کہنا تھا کہ یہ افسانہ ہے آرٹیکل نہیں۔ ریاستی سرکار نے ایک کمیشن بنایا۔ نو مہینوں کے بعد کمیشن کی رپورٹ میں مجھے بری قرار دیا گیا اور مجھے بحال کر دیا گیا۔

ایک دِن شیخ غلام رسول صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں بُلایا اور کہا کہ ''دریا میں رہنا ہو تو مگر مچھ سے بیر نہیں رکھتے۔ تم اچھا لکھتے ہو۔ تمہاری قلم میں دم ہے۔ اس لئے اپنی قلم کو اچھائی کے لئے استعمال کرو۔ دوسروں کی نجی زندگی میں جھانکنا چھوڑ دو۔ دوسروں کے عیبوں پر نظر رکھنے کی بجائے اپنی خامیوں کو تلاشو اور مثبت رویہ اپناؤ۔ آج کے سماجی اور اقتصادی مسائل کے بارے میں لکھو۔ دِل کو چھو لینے والے موضوعات پر قلم اُٹھاؤ۔ اور اپنے لئے کوئی اچھی سی پوسٹ دیکھو جہاں تمہیں تعینات کر دیا جائے۔'' میں اُس وقت ''ماہنامہ دیہات سُدھار'' کا نائب مدیر تھا اور مشہور اُردو افسانہ نگار نور شاہ اُس ماہنامہ کا مدیر۔ ایک دِن شیخ غلام رسول صاحب نے مجھے پھر اپنے کمرے میں بُلایا اور کہا کہ محکمہ منصوبہ بندی میں ایک مُترجم کی آسامی خالی ہوئی ہے۔ اُس کے لئے درخواست دو۔ میں نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے عرضی دے دی۔ انٹرویو کمیٹی کے چیئرمین خود شیخ صاحب تھے اور انہوں نے مجھے چُن لیا۔ جب مرزا محمد افضل بیگ صاحب 1975 میں وزیر بنے تو اُنھیں ایک ایسے پرسنل اسسٹنٹ کی ضرورت تھی جو انگریزی اور اُردو کے علاوہ جموں اور کشمیر ک مقامی زبانیں بھی جانتا ہو۔ چنانچہ سیکریٹری کلچرل اکادمی محمد یوسف ٹینگ کی نشاندہی پر شیخ غلام رسول صاحب نے مجھے بیگ صاحب کا پی۔اے بنا دیا۔ 1978ء میں شیخ صاحب نے ہی مجھے ترقی دے کر ماہنامہ ''دیہات سُدھار'' کا مُدیر اور نور شاہ صاحب کو ڈپٹی ڈائریکٹر پنچایت بنایا۔ شیخ غلام رسول صاحب کے ہاتھوں سے ہی میرا بلاک ڈیولپمنٹ افسر بننے کا آرڈر جاری ہوا کیونکہ کمشنر محمود الرحمن صاحب اُسی روز کسی دوسرے محکمہ میں تبدیل کر دیئے گئے تھے۔ شیخ غلام رسول صاحب کے ہاتھوں سے ہی میری بحیثیت اے۔سی۔ڈی ڈوڈہ تعیناتی کا آرڈر جاری ہوا۔ انہوں نے ہی بحیثیت چیف سیکرٹری میری اِنڈکشن کشمیر ایڈمنسٹریٹو سروس میں کی اور مجھے ڈپٹی ڈائریکٹر اسسٹنٹ جموں تعینات کیا۔ اُنھیں میرے ساتھ دِلی لگاؤ تھا۔ وہ مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے تھے اُنھیں اس بات کا بڑا احساس تھا کہ میرا سارا خاندان 1947ء میں شہید کر دیا گیا تھا اور یتیمی اور مسکینی کے باوجود میں نے بی۔اے (آرنز) کیا تھا، اور صحافت میں ڈپلومہ بھی حاصل کیا تھا۔ کئی بار وہ مجھے بُلا کر افسر شاہی کے گُر سکھاتے۔ سچ تو یہ ہے کہ شیخ غلام رسول صاحب میرے گاڈ فادر ہیں اور مجھے فرش سے عرش پر پہنچانے والے ایک فرشتہ صفت انسان۔ شیخ صاحب مذہبی رسوم کے پابند ایک نیک رُوح شخصیت ہیں۔ غریب پرور، رشتوں کو عزت دینے والے۔ دوران سروس اُنہوں نے ہندو اور مسلمان میں کبھی تفریق نہیں کی۔ جموں یا کشمیر کے لوگوں میں کوئی فرق نہیں کیا۔ جو بھی آیا، اُس کی مدد کی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ریاست کے ہر طبقے میں

مقبول تھے۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں، ان کی نوازش اور محبت کا صدقہ ہوں۔ ایسی نیک روحیں دُنیا میں بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔ اسی لئے قابل احترام ہوتی ہیں۔ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد قانون ساز کونسل کے ممبر بھی رہے اور آج کل فلاحی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ اللہ اُنھیں صحت وتندرستی بخشے اور اولاد کا سکھ نصیب کرے

تالاب تو برسات میں ہو جاتے ہیں کم ظرف باہر کبھی آپے سے سمندر نہیں جاتا (اعجاز رحمانی)

مولانا محمد سعید مسعودی: مسعودی صاحب شیخ محمد عبداللہ کے دیرینہ ساتھی تھے اور شخصی راج کے خاتمے اور آزادی کی جدوجہد کرنے والوں میں ایک ایسے مجاہد تھے جنہوں نے ''کشمیر چھوڑ دو'' تحریک چلانے کے لئے شیخ محمد عبداللہ کا بھرپور ساتھ دیا حالانکہ وہ پرنس آف ویلز کالج جموں میں عربی کے لیکچرار تھے۔ شخصی حکومت کے خلاف 13 جولائی 1931ء سے جو تحریک شروع ہوئی تو شیخ صاحب کے قریبی ساتھیوں اور عام لوگوں کا یہ ماننا تھا کہ مولانا محمد سعید مسعودی اور مرزا محمد افضل بیگ شیخ صاحب کے دو بازو اور سیاسی دماغ ہیں اور یہ بات سچ بھی تھی۔ اسی لئے لوگ اُنہیں مفکّر کشمیر اور فخر کشمیر کہتے تھے مولانا مسعودی غیر کشمیری تھے اور کرناہ کے رہنے والے تھے اور پہاڑی (پوٹھواری) بولنے والے لوگوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ اُنہوں نے اپنی مستقل سکونت گاندربل میں اختیار کر لی تھی۔ جن غیر کشمیری لیڈروں نے شخصی راج کے خلاف بغاوت میں حصہ لیا تھا، اُن میں مولانا مسعودی ایک بلند پایہ لیڈر تھے۔ جب شیخ محمد عبداللہ نے مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لعل نہرو کے مشورے پر مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کیا تو مولانا مسعودی کو نیشنل کانفرنس تنظیم کا جنرل سیکرٹری بنایا گیا۔ نیشنل کانفرنس کا ترانہ بھی مولانا مسعودی نے ہی لکھا تھا، جس کے بول ہیں:

لہرا اے کشمیر کے جھنڈے طفل وجوان و پیر کے جھنڈے
ہر سُو لہرا ہر دم لہرا لہرا اے کشمیر کے جھنڈے

جب 1953 میں وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ کو ملک سے غداری کے الزام میں گرفتار کیا گیا تو اُن کے ساتھ مرزا محمد افضل بیگ اور کئی دیگر رہنماؤں کے ساتھ ساتھ مولانا مسعودی کو بھی قید میں رکھا گیا۔ وہ بھی لگاتار دس سال تک یعنی 1964 تک جیل میں بند رہے۔ جب 1964ء میں پنڈت جواہر لعل نہرو نے شیخ محمد عبداللہ کو پاکستان کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے ساتھ کشمیر مسئلہ پر حتمی بات چیت کرنے کے لئے راولپنڈی بھیجا تو اُس وفد میں مولانا محمد مسعودی بھی اُن کے ہمراہ تھے۔ یہاں یہ بات لکھنے میں شاید کوئی قباحت نہیں ہے کہ کشمیری مسلم لیڈرشپ جموں کے مسلم لیڈروں کو

برابری کا درجہ نہیں دیتی تھی جس کی وجہ سے کئی بار وہ آپس میں ہی اُلجھ پڑتے ۔غیر کشمیری، خاص کر جموں کے لیڈران کا جھُکاؤ مسلم کانفرنس کی طرف تھا جو پاکستان سے الحاق کے حق میں تھی۔جبکہ کشمیری لیڈرشپ شیخ محمد عبداللہ کی سربراہی میں نیشنل کانفرنس کے ساتھ مکمل طور پر جڑی ہوئی تھی۔ مولانا محمد سعید مسعودی حالانکہ نیشنل کانفرنس کے ایک مضبوط ستون تھےلیکن غلام محمد شاہ(گل شاہ) اور مرزا محمد افضل بیگ اُن کو پسند نہیں کرتے تھے۔ پارٹی کی اندرونی مخالفت کی وجہ سے مولانا مسعودی نے سیاست سے ہی کنارہ کشی کرلی اور گاندربل میں اپنے گھر خاموشی سے زندگی گزارنے لگےلیکن جب بھی کبھی شیخ صاحب یا نیشنل کانفرنس کسی مشکل حالات سے گزرتی تو مسعودی صاحب سے صلاح مشورہ ضرور کیا جاتا۔1977ء میں مولانا مسعودی نے اپنی سیاسی زندگی کا بدترین فیصلہ لیا اوراس محاورے کو سچ کردکھایا کہ''سیانا کوّا ڈھیر پر جا بیٹھتا ہے'' وہ مرکزی وزراء بابوجگجیون رام اور چوہدری چرن سنگھ کے بہکاوے میں آکر دوبارہ سیاست میں آگئے اور جموں کشمیر جنتا پارٹی کے سرپرست بن گئے۔مرکزی سرکار نے مولانا محمد سعید مسعودی کو شیخ محمد عبداللہ کے مدمقابل ایک چیلنج بنا کر کھڑا کیا تاکہ انتخابات میں مولانا کا نام اور شخصیت کا بھرپور فائدہ اٹھایا جاسکے۔مولانا مسعودی نے خودتو چناؤ نہیں لڑالیکن جنتا پارٹی کے اُمیدواروں کے لئے مولوی فاروق کے ساتھ مل کر انتخابی جلسوں میں حصہ لیا جوجنتا پارٹی کے مقامی صدر تھے۔جنتا پارٹی کے سارے اُمیدوار چناؤ میں ہار گئے ماسوائے عبدالرشید کابلی کے، اور شیخ محمد عبداللہ کی جماعت نیشنل کانفرنس دوتہائی اکثریت سے پھر اقتدار میں آگئی اور شیخ صاحب تیسری بار برسراقتدار آگئے۔اس آزادانہ اورغیر جانبدارانہ انتخابات کی وجہ سے مسعودی صاحب کوشرمندگی اُٹھانا پڑی اوروہ اپنے گھر گاندربل میں قید ہوکر رہ گئے کیونکہ نیشنل کانفرنس جماعت اُن کے خلاف ہوگئی تھی۔1977ء کے بعد شیخ محمد عبداللہ اور مولانا مسعودی کے ذاتی تعلقات بھی ختم ہوگئے۔لیکن جب پردھان منتری اندرا گاندھی نے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی سرکار گورنر جگموہن کے ذریعے برخاست کروادی تو مادرِمہربان بیگم اکبر جہاں اپنے بیٹے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو لیکر مسعودی صاحب کو ملنے گاندربل گئیں۔ دونوں ماں بیٹے بھارت سرکار کی غیر جمہوری کاروائی اور خاص کر شریمتی اندرا گاندھی کے وطیرے کی وجہ سے دل برداشتہ، مایوس اوراُداس تھے۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کا کہنا تھا کہ کانگریس سرکار نے کبھی بھی کشمیریوں کے جمہوری حقوق کوتسلیم نہیں کیا۔ مادرِمہربان بیگم عبداللہ نے مولانا مسعودی سے مرحوم شیخ محمد عبداللہ اور پارٹی کے رویے کے لئے افسوس کا اظہار کیا اور پرُانی باتیں بھُول جانے کی استدعا کرتے ہوئے مولانا سے گزارش کی وہ فاروق

عبداللہ کو نصیحت کریں کہ وہ کس طرح کٹھن سیاسی اُلجھن کو سلجھائے۔ براہِ مہربانی اِس کی مشکل کشائی کریں۔مولانا مسعودی نے ڈاکٹر فاروق صاحب سے یہ الفاظ کہے تھے:

''جب 1953ء میں محترم شیخ محمد عبداللہ کی سرکار مرکز نے برخاست کردی تھی اور اُنھیں گرفتار کر لیا تھا تو اُس وقت لوک سبھا میں شیخ صاحب کے حق میں صرف دو ممبران پارلیمنٹ نے احتجاج کیا تھا، ایک میں تھا اور دوسرا اشوک مہتہ، لیکن آج صورتِ حال یکسر تبدیل ہے۔ تمہارے حق میں 147 ممبرانِ پارلیمنٹ نے مرکزی سرکار کے فیصلے کے خلاف زوردار آواز اُٹھائی ہے۔ اس لئے میری تمہیں یہی نصیحت ہے کہ اِس ٹیمپو (لہر) کو برقرار رکھو۔'' یہ بات مجھے مولانا مسعودی صاحب نے خود سنائی تھی جب میں 1985ء میں اُن کو ملنے گاندربل گیا تھا۔ ایک گھاس کی چٹائی (ہگُو) پر بیٹھا درویش جیسا شخص اون کا لمبا چوغہ پہنے (کشمیری فِرن) مجھے شیخ صاحب، بیگ صاحب، بخشی صاحب، غلام محمد صادق، شیام لعل صراف اور دُرگا پرشاد دھر کی سیاسی عیاری، مکاری اور ہوشیاری کی کہانیاں سنا رہا تھا۔ مولانا کشمیر کی آزادی کے لئے کی جانے والی جدوجہد کا جیتا جاگتا کردار تھے لیکن اُنہوں نے کشمیر مسئلے یا اپنے رفقا کے بارے میں کچھ نہیں لکھا جبکہ وہ ایک اعلیٰ پائے کے ادیب تھے۔ یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے۔ اللہ اُنھیں غریقِ رحمت کرے ؎

ہاں! میں نے لہو اپنا گلستاں کو دیا ہے مجھ کو گل و گلزار پہ تنقید کا حق ہے (ساغر صدیقی)

چوہدری تاج محی الدین: تاج میرے بچپن کا جگری دوست ہے۔ اُس کے والدِ محترم چوہدری خُدا بخش ڈوگرہ حکومت میں جموں وکشمیر سٹیٹ آرمی کے سالار تھے۔ اُن کے اجداد پاکستانی پنجاب کی تحصیل شکر گڈھ کے رہنے والے تھے اور وہاں سینکڑوں ایکڑ زمین کے مالک تھے۔ بریگیڈئر خدا بخش کے دادا نے کٹھوعہ میں ایک پورا چک خریدا اور وہاں آ کر رہنے لگے۔ اس چک کا نام ''چک سونا نوپا'' تھا۔ کالی بڑی، ڈپٹی کمشنر کٹھوعہ، ڈگری کالج کٹھوعہ، پولیس کا ہیڈ کوارٹر اور کئی دیگر دفاتر اور کرن نگر کالونی، اسی چک والی زمین پر بنے ہیں جو 1947ء کے بعد خاتمہ چک داری قانون کے تحت اس خاندان سے چھین لی گئی تھی۔ چوہدری خُدا بخش ریاستی فوج میں لفٹین بھرتی ہوئے تھے جب وہ کرنل بنے تو اُن کو دوسری عالمی جنگ میں حصہ لینے کے لئے بھیجا گیا جہاں اُنہوں نے مصر اور عراق کے محاذ پر انگریز بٹالین کی کمانڈ کی تھی اور اُس ڈویژن کا جرنیل لارڈ منٹگمری تھا۔ اُن کو ''آرڈر آف برٹش ایمپائر'' ملا۔ خان بہادر کا خطاب اور ملتان میں جاگیر بھی ملی۔ وہ ریاستی فوج کے سالار بن کر ریٹائر ہوئے ان کی پہلی شادی اپنے ننھیال شکر گڈھ میں ہوئی تھی اُس شادی سے اُن کے دو بچے تھے۔ ایک

بیٹا اور بیٹی ۔ پہلی بیوی کی وفات کے بعد قبلہ خدا بخش صاحب نے دوسری شادی ایک کشمیری خاتون سے کی جس کا تعلق کشمیر کے ایک معزز ''میر'' خاندان سے تھا۔ اُس کے تین بھائی ریاست کے اعلیٰ عہدوں پر تعینات رہے ۔جن میں میر ظفر اللہ ریاست کے چیف سیکرٹری اور بعد ازاں مرکزی سرکار میں سیکرٹری اگریکلچر رہے ۔ دوسری بیوی سے قبلہ خدا بخش صاحب کے بارہ بچے تھے ۔ ماشاء اللہ سارے کے سارے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بڑے بڑے عہدوں پر براجمان رہے ۔تاج محی الدین اُن کی چھٹی اولاد تھی ۔ بریگیڈئر صاحب کی کشمیر میں بہت بڑی جائیداد تھی ۔ باغات اور دھان کی زمین وغیرہ ،جس کی وجہ سے تاج کا بچپن اور جوانی خوشحالی میں گزری ۔ ہمارا گھر بٹہ مالو باراں پتھر میں تھا اور ہم تاج محی الدین کے ہمسایہ تھے ۔ چوہدری خدا بخش کے مکان اور جرنیلی سڑک کے پار کمیٹی باغ ہوا کرتا تھا۔ جہاں میں اور تاج دیگر دوستوں کے ساتھ ہاکی کھیلتے ۔ہم دونوں بہت شرارتی تھے اور اکثر اپنے دوستوں کو تنگ کیا کرتے ۔بچپن میں تاج کو جیب خرچ کے لئے ایک معقول رقم ملتی تھی جبکہ مجھے موری والا تانبے کا ایک پیسہ ۔ وہ اپنے جیب خرچ سے دوستوں کو چنے ،موٹھ ، ٹافیاں وغیرہ کھلاتا ،اور جوانی میں ہم دوستوں کو'' کافی ہاؤس'' لے کر جاتا جو ریزیڈنسی روڈ کی شناخت تھا۔ وہاں کافی کی چسکیوں پر دوستوں کی محفلیں جمتیں ۔خوب گپ بازی ہوتی اور یہ روز کا معمول تھا۔تاج محی الدین شاہ خرچ تھا اور سخاوت اُس کی فطرت میں تھی ۔ وہ اکثر ہم دوستوں کو'' احدُو'' ہوٹل میں واز وان کھلانے لے جاتا ۔کباب، کانتی ،مکھن ٹوسٹ اور چائے کی سیوا ہفتے میں تقریباً دو تین بار ضرور ہوتی ۔

گو تاج محی الدین امیری ٹھاٹھ میں رہتا تھا اور اپنا کاروبار کرتا تھا۔لیکن اُس کا دِل درویشی کی خُو سے لبریز تھا۔اُس نے زندگی میں کبھی کسی کو کمتر نہیں سمجھا۔ نہ وہ کسی کی چُغلی کرتا یا کسی کی بدخوئی سنتا اور نہ ہی خود کسی کی غیبت کرتا۔ اُس نے مجھ جیسے غریب دوست کو ساری عمر اپنے سینے سے لگائے رکھا اور کبھی مذاق میں بھی اس بات کا احساس نہیں کرایا کہ وہ ایک امیر باپ کا بیٹا ہے یا میں اُس کی برابری کیسے کرسکتا ہوں ، بلکہ ہمیشہ میرے دُکھ سکھ کا ساتھی رہا۔ ہماری دوستی اللہ کے فضل سے مثالی رہی ۔تاج اُن دِنوں فرنیچر بنانے والی فیکٹری ''شال ٹینگ'' میں چلا رہا تھا جس کا نام تھا ہندوستان جوائنیری مِل ۔'' آمدنی اچھی تھی ، باغوں کی کمائی اور دُکانوں کا کرایہ الگ۔ اس لئے بےفکری اور مستی کا دور تھا۔ایک دِن تاج مجھ سے کہنے لگا کہ وہ سیاست میں کودنا چاہتا ہے اور اُس کی بات آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر سے چل رہی ہے اور وہ اُسے جموں وکشمیر اکائی کا صدر بنانے کے لئے تیار ہے ۔ پھر ایک دِن وہ کافی ہاؤس میں اخبار'' ٹائمز آف انڈیا'' کی کاپی لیکر آیا اور دوستوں کے سامنے رکھ دی ۔

جس میں لکھا تھا کہ تاج محی الدین نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی ہے لیکن جلد ہی تاج کو سمجھ آ گئی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا کریلا کشمیر کی سیاسی دیگچی میں پک نہیں سکتا۔ اس لئے اُس نے کانگریس پارٹی جائن کر لی ، اور آہستہ آہستہ کانگرس کی ٹونڈی (ناف) میں جا گھسا۔ اُس نے گوجر برادری کا سہارا لیا اور مرکز میں امور داخلہ کے وزیر راجیش پائلٹ کے ساتھ یاری کا جھولا جھولنے لگا۔ یہ وہ وقت تھا جب ملی ٹینسی کے نیولے ارضِ کشمیر کے بلّوں یا سوراخوں سے باہر نکلنا شروع ہو گئے تھے۔ ہوا کا رُخ تبدیل ہو رہا تھا۔ آزادی کے نعرے لگنے لگے تھے۔ کشمیری پنڈت اور ہندنواز مسلمان کشمیر چھوڑ کر بھاگ رہے تھے لیکن ان پُر آشوب دِنوں میں تاج نے کشمیر نہیں چھوڑا۔ اکیلے کانگریس جماعت کو چلاتا رہا اور بھارت کا جھنڈا ہر جلسے، جلوس میں لہراتا رہا۔ بلکہ اُس نے کانگریس کے مرکزی لیڈران اور وزراء کو کشمیر میں لا کر اُن کے بڑے بڑے جلسے کروائے اور پارٹی کو زندہ رکھا۔ جنگجوؤں نے اُس پر گولیاں چلائیں۔ اُس کے گھر پر گرنیڈ پھینکے لیکن ''جا کو رکھے سائیاں، مار سکے نہ کوئے۔'' تاج ہر حملے میں بچ جاتا اُس کا عزم اور پختہ ہوتا۔ وہ دور دراز علاقوں میں جا کر جلسے کرتا۔ لوگوں سے ملتا اور اُنہیں سمجھاتا کہ دہشت گردی تباہی مچاتی ہے۔ اس لئے ملی ٹینٹوں کا ساتھ نہ دیں اور اپنے گھروں کو اُجڑنے سے بچائیں۔ زندگی کو موت کے حوالے نہ کریں۔ وہ لوگوں کو دلیل سے سمجھاتا کہ اُن کا مستقبل ہندوستان کے ساتھ جڑا ہے۔ ہندوستان میں رہ کر ہی جموں کشمیر ہر میدان میں ترقی کر سکتا ہے۔ اس لئے بنیاد پرستوں کی باتوں میں نہ آئیں۔ اُس کی وجہ سے راجیش پائلٹ اور دوسرے مرکزی رہنما اُوڑی، کرناہ، کپواڑہ، اننت ناگ کے کانگریسی جلسوں میں بھاشن دے سکے۔ تاج محی الدین نے کشمیر میں مردہ کانگریس کو پھر زندہ کیا جبکہ بھارت ماتا کے بڑے بڑے سپوت کپُوت ثابت ہوئے۔ تاج محی الدین نے کانگریس کی ٹکٹ پر اننت ناگ سے لوک سبھا کا چناؤ بھی لڑا، لیکن اکھوانی بندوق برداروں کی دہشت نے کانگریس ورکروں کو ووٹ ڈالنے نہیں دیا اور اُس وقت کی مرکزی سرکار کی ایما پر جنتا پارٹی کے اُمیدوار مقبول ڈار کو جتایا گیا، جسے بعد میں مرکزی سرکار میں نائب وزیر داخلہ بنایا گیا۔ 1996ء میں تاج نے کانگریس کی ٹکٹ پر اُوڑی سے چناؤ لڑا لیکن نیشنل کانفرنس کے اُمیدوار جناب محمد شفیع اُوڑی سے ہار گیا۔ جو مقامی امیدوار تھا اور چار بار الیکشن جیت چُکا تھا۔ اس ہار کے بعد تاج محی الدین نے فیصلہ کیا کہ وہ مستقل طور پر اُوڑی میں رہے گا اور لوگوں کی خدمت کرے گا اُس نے وہاں اپنا مکان بنایا۔ کانگریس کی بنیاد مضبوط کی۔ لوگوں کے مسائل اور مشکلات دور کرنے کے لئے فوجی اور سول انتظامیہ کی خاک چھانی اور مقبولیت کی بلندیوں کو چھویا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 2002ء کے انتخابات میں

کانگریس کی ٹکٹ پر وہ اُوڑی سے چناؤ جیت گیا۔ الیکشن کے بعد کانگریس اور پیپلز ڈیموکریٹ پارٹی(PDP) کی ملی جلی سرکار میں تاج محی الدین کو محکمہ خوراک اور امورِ صارفین کا وزیر بنایا گیا۔وزیر بنتے ہی اُس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مجھے اپنے محکمے میں سپیشل سیکرٹری تعینات کروایا اور ریٹائرمنٹ کے بعد جموں وکشمیر سٹیٹ کنزیومر کمیشن کا پانچ سال کے لئے ممبر بنایا۔اور یہ ثابت کردیا کہ اہل ظرف لجپال لوگ ہوتے ہیں اور خالد حسین کے لئے تاج اُس کا لجپال تھا۔2008ء میں تاج دوبارہ اُوڑی انتخابی حلقے سے کامیاب ہوااور نیشنل کانفرنس،کانگریس کی ملی جلی سرکار میں پھروزیر بنایا گیا۔اور اُسے محکمہ آبپاشی کا قلمدان سونپا گیا۔لیکن اُس کی طبیعت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔وہ ہمیشہ کی طرح زمین سے جُڑا رہا۔یاروں کے ساتھ دوستی نبھاتا رہا۔کئی غریب دوستوں کی مالی کفالت بھی کرتا رہااور وہ بھی اِس طرح کہ''دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کا پتہ نہ چلے''غُصہ،گھمنڈ یا اہنکار کبھی تاج کے پاس سے بھی نہیں گزرا۔تاج میرے اچھے اور بُرے وقتوں کا دوست ہے۔دوستوں میں شاید میں واحد ایسا دوست ہوں کہ جس پر تاج نے مکمل اور کامل بھروسہ کیا،بھرپور اعتماد کیا اور خدا کے فضل سے میں بھی اُس کے اعتماد پر ہمیشہ پورا اُترا۔ہم دونوں ایک دوسرے کے ہمراز تھے اور زندگی کے اہم فیصلے باہمی مشاورت سے کرتے۔ایسے دلنواز اور سچے دوست اللہ سائیں کسی کسی کو بخشش میں دیتا ہے۔ یہاں مجھے پروین کمار اشک کا یہ شعر یاد آرہا ہے ؎

خدا ہر ایک کو اپنا پتہ نہیں دیتا   کِسی کِسی کو تھماتا ہے چابیاں گھر کی

خداوند کریم تاج کو صحت بخشے۔عزت اور شہرت میں برکت کرے۔کیونکہ تاج جہاں دل کا امیر ہے وہاں من کا فقیر ہے۔وہ سخی حاتم ہے کئی یتیم بچوں اور بیوہ عورتوں کی مالی مدد کرتا ہے۔تاج محی الدین کو ادب اور تاریخ سے خاص دلچسپی ہے۔وہ ایک زیرک انسان ہے۔اُس نے ادب،تاریخ،فلسفہ، مذہب اور سائنسی علوم پر بے شمار کتابیں پڑھی ہیں۔وہ کسی بھی موضوع پر گھنٹوں بات کرسکتا ہے۔وہ ایک دانشور ہے اُس کا دماغ کمپیوٹر ہے اور سوچ ترقی پسند۔پانی،سینچائی اور سیلابوں پر قابو پانے والے محکمہ جات کا وزیر بنتے ہی اس نے دریائے توی کے پانی کو روک کر ایک مصنوعی جھیل بنانے کا منصوبہ ازخود بنایا۔یہ جھیل گوجر نگر اور گورکھا نگر سے لیکر توی دریا کے چوتھے پل تک بنی تھی اور اس کی لمبائی تقریباً 2 کلومیٹر ہونی تھی۔چوتھے پُل سے تھوڑا پہلے پندرہ فٹ اُونچا باندھ بنایا جانا تھا اور بڑی اور چھوٹی توی کے درمیان جو زمین کا ٹاپو ہے اُس میں پارک اور ریسٹورینٹ بننا تھا۔اور جھیل کے دونوں اطراف خوبصورت باغ بنانے کی تجویز تھی۔یہ سارا پروجیکٹ ریاستی سرکار نے منظور

کر لیا تھا اوراس پر تیزی سے کام شروع بھی ہو چکا تھا یہاں تک کہ بیراج کے ستون بھی کھڑے کئے جا چکے تھے کہ نیشنل کانفرنس اور کانگریس کے ملی جلی سرکار کی مدت ختم ہوگئی اور نئے الیکشن کروائے گئے ۔ 2014ء کے انتخابات میں صوبہ جموں کی 25 نشستوں پر بھارتیہ جنتا پارٹی کے اُمیدوار کامیاب ہو گئے اور کشمیر میں پی۔ڈی۔پی 28 اسمبلی حلقوں پر جیت گئی اور دونوں جماعتوں نے مل کر حکومت بنائی اور ریاست کے ترقیاتی ایجنڈے کو چھوڑ کر مذہب اور نفرت کی سیاست کا آغاز ہوا۔ نارتھ اور ساؤتھ پول آپس میں مل نہیں سکے اور پہلے گورنر راج اور اب مرکزی راج چل رہا ہے۔جھیل کا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا کیونکہ جوڑ توڑ کی سیاست میں اس طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا۔تاج محی الدین نے دوسرا فیصلہ یہ لیا کہ پنجاب کی سرکار کو مجبور کیا کہ وہ جموں وکشمیر اور پنجاب کی سرکاروں کے درمیان ہوئے سمجھوتے کے مطابق رنجیت ساگر ڈیم (تھین ڈیم) سے 20 فیصد بجلی ریاست کو مہیا کرے۔پنجاب سرکار یہ معاملہ مرکزی سرکار کے پاس لے گئی۔جس نے جموں کشمیر کے حق میں فیصلہ دیا۔اس فیصلے کے مطابق پنجاب سرکار نے 20 فیصد بجلی دینے کے علاوہ شاہ پور کنڈی نہر بنانی تھی اور اُس میں سے ریاست جموں وکشمیر کو آبپاشی کے لئے اُس کے حصے کا پانی دینا تھا۔پنجاب سرکار نے شاہ پور کنڈی نہر نہیں بنائی۔ چنانچہ تاج محی الدین نے ریاستی کیبنٹ سے یہ قرارداد منظور کرائی کہ دریائے راوی سے ریاستی محکمہ آبپاشی اپنی الگ سے نہر نکالے گا تاکہ اُس کے کنڈی علاقے سیراب ہوسکیں۔ یہ تاریخ ساز فیصلے اس سے پہلے کسی ریاستی سرکار نے نہیں لئے تھے۔ایک اور قابل تعریف کام تاج نے یہ کیا کہ نیشنل ہائڈرو پاور کمیشن (NHPC) سے مطالبہ کیا کہ وہ ریاستی دریاؤں کا پانی استعمال کرنے کے عوض ریاستی سرکار کو آبیانہ یا واٹر ٹیکس ادا کرے۔اِس سلسلہ میں تاج محی الدین نے ایک ایکٹ بنوایا۔اور اُسے قانون ساز اسمبلی سے پاس کروایا اور اُسے لاگو کرنے کے لئے تمام انتظامات کئے ۔NHPC والے اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں گئے لیکن عدالتِ عالیہ نے ریاستی سرکار کا فیصلہ برقرار رکھا۔آج NHPC والے ریاستی حکومت کو متواتر آبیانہ دے رہے ہیں۔
مندرجہ ذیل اقدامات سے تاج محی الدین کی دُور اندیشی اور بے خوفی کا پتہ چلتا ہے۔اُس نے تو اُوڑی (اول) اور سلال بجلی پروجیکٹ ریاست کو واپس کرنے کے سلسلے میں بھی مرکزی سرکار کو خط لکھنے شروع کر دیئے تھے کیونکہ سمجھوتے کی رُو سے ریاستی سرکار ایسا کرسکتی تھی۔ولر بیراج پر بھی 60 فی صد کام ہو چکا تھا لیکن عمر عبداللہ سرکار ختم ہونے کے بعد پچھلے سات سالوں میں کسی نے ان امور کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔اللہ میرے یار کو صحت مند زندگی عطا کرے اور وہ عوام کی خدمت کرتا رہے

۔آمین ے

میں نے اپنے دشمنوں میں خوبیاں کی ہیں تلاش
اِس طرح سے مجھ میں اپنی خامیاں کم ہوگئیں (نامعلوم)

دھریندر برہمچاری: دھریندر برہمچاری سے میری پہلی ملاقات 1981ء میں موضع ڈُھونہ لاٹی میں ہوئی جہاں وہ میری خوش دامن صاحبہ سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ وہ مان تلائی آشرم میں ایک ہسپتال بنانا چاہتا تھا۔جس کی اجازت ریاستی سرکار سے حاصل کرنا ضروری تھی۔ ریاستی سرکار ایک غیر ریاستی باشندے کو ہسپتال بنانے کی منظوری نہیں دے رہی تھی۔ میری خوش دامن صاحبہ ممبر قانون ساز کونسل تھیں اور دھریندر برہمچاری چاہتا تھا کہ وہ وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ سے ان کی سفارش کریں اور ہسپتال بنانے کی منظوری دلا دیں۔ میں اپنی اہلیہ اور بچوں کے ساتھ اپنے سسرال گیا تھا تا کہ اپنی سالی اور سالے کی شادی میں شرکت کی جا سکے۔ وہاں دھریندر برہمچاری سے میری تفصیلی بات چیت ہوئی۔ جس میں مان تلائی آشرم کی تعمیر یوگ سنٹر اور یوگ سیکھنے کے لئے غیر ملکی افراد کا آنا، اعلیٰ اقسام کے پھل دار درخت اور خصوصاً سیب کے باغات نیز اعلیٰ نسل کی جرسی گائیں اور گھوڑے پالنے سے متعلق جانکاری حاصل ہوئی۔ وہ اپنی جیپ میں آیا تھا۔ اس نے چند گھنٹے ہمارے ساتھ گزارے اور پھر واپس مان تلائی آشرم چلا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد دھریندر برہمچاری، میری خوش دامن صاحبہ اور میں سرینگر گئے اور قبلہ شیخ صاحب سے ملے۔ وہاں دھریندر برہمچاری نے کہا کہ وہ ایک سو بستروں کا ہسپتال بنانا چاہتا ہے جس کے لئے سارے سرجیکل آلات اور متعلقہ مشینیں جرمنی، انگلینڈ اور دیگر بیرونی ممالک سے منگوائی جائیں گی۔ ہسپتال مکمل ہونے کے بعد وہ اُسے ریاستی سرکار کو سونپنے کے لئے تیار ہے تا کہ مقامی لوگوں کا مفت علاج ہو سکے۔ میری خوش دامن صاحبہ نے شیخ صاحب سے گزارش کی کہ ہسپتال بنانے کی اجازت دے دیں۔ دھریندر برہمچاری عمارت کو کہاں لے جائے گا۔ آخر یہ ہسپتال مقامی باشندوں کے ہی کام آئے گا۔ وزیر اعلیٰ نے بالآخر اجازت نامہ جاری کروا دیا۔اور ہسپتال کا کام دھریندر برہمچاری نے زور وشور کے ساتھ شروع کر دیا۔ دھریندر برہمچاری 12 فروری 1924ء کو بہار میں پیدا ہوا اور 9 جون 1994ء کو مان تلائی میں ہی ہوائی حادثے میں ہلاک ہوا۔اُس کا اصل نام دھریندر چوہدری تھا اور وہ موضع چانپورہ مدھوبنی میں پیدا ہوا تھا۔ وہ کنڈلنی یوگا سکھاتا تھا۔ وہ پردھان منتری اندرا گاندھی کا یوگ گورو تھا۔اُس کے مزید دو آشرم کٹڑہ (ریاسی) اور بھونڈسی، گوڑگاؤں میں بھی تھے۔ 13 سال کی عمر میں اُس نے گھر چھوڑ دیا اور وارانسی آ گیا۔اُس

کا گورومہارشی کار تکلیا تھا جس کا آشرم لکھنؤ سے 18 میل دور گوپال کھیرا میں تھا جہاں دھریندر برہمچاری نے 1960ء تک یوگا کی تعلیم حاصل کی۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے اُسے اپنی بیٹی اندرا گاندھی کو یوگا سکھانے کے لئے بلایا تھا۔تا کہ اس کی صحت بہتر ہو سکے 1975ء میں جب اندرا گاندھی نے ایمرجنسی لگائی اور سارے ملک میں اس کے خلاف مظاہرے ہونے لگے تو وہ اس مشکل وقت میں اندرا گاندھی کے ساتھ کھڑا رہا۔اور تب تک اُس کے ساتھ جُڑا رہا جب تک کہ وہ پھر سے اقتدار میں نہیں آ گئی۔اس طرح وہ ایک اہم سیاسی شخصیت بن گیا۔اندرا گاندھی کی پشت پناہی سے وہ 1970ء سے دوردرشن پر یوگ ابھیاس کا پروگرام بھی دے رہا تھا۔اُس کی کوشش سے دہلی کے سکولوں میں یوگا ایک مضمون کے طور پر پڑھایا جانے لگا تھا۔اس نے دہلی میں وشوایاتن یوگ آشرم بنایا، جسے آجکل ''مرارجی ڈیسائی نیشنل انسٹیچیوٹ آف یوگا'' کہا جاتا ہے۔اُس نے جموں، کٹڑہ اور مان تلائی میں مقامی لوگوں کے نام پر آشرم بنانے کے لئے زمین خریدی، اور آشرم بنائے۔اس کے علاوہ اُس نے جموں میں ایک گن فیکٹری بھی لگائی جس کا لائسنس اندرا گاندھی کے کہنے پر بھارت سرکار نے دیا۔اُس پر الزام تھا کہ اس نے شِوا گن فیکٹری کے لئے سپین سے 500 بندوقیں چوری سے لائیں جس پر اُس کے خلاف اندرا گاندھی کی وفات کے بعد مقدمہ بھی درج کیا گیا۔وہ سیاسی طور پر اتنا طاقتور بن گیا تھا کہ مختلف ریاستوں کے وزراءاعلیٰ اور وزرا محترمہ اندرا گاندی سے سیاسی فائدہ حاصل کرنے کے لئے اُس کی مدد لیتے تھے۔جس کے لئے وہ اُسے بھاری رقوم دیتے تھے۔ بیرون ملک دفائی ساز وسامان کے سودے کرانے میں بھی اُسے لاکھوں ڈالر کے نذرانے ملتے۔یہ رقومات اُس نے اپنے آشرموں کو جدید سے جدید تر بنانے پر صرف کیں۔اُس نے سدھ مہادیو سے مان تلائی تک 7 کلومیٹر کی سڑک خود بنائی۔اپنے ہوائی جہاز کے لئے رن وے تعمیر کی۔بڑے بڑے ٹرک، بلڈوزر اور کاریں خریدیں۔یوگ سیکھنے کے لئے بیرونی ملکوں سے آنے والے لوگوں کے لئے شاندار ہوسٹل تعمیر کیا اور پانچ منزلہ ہسپتال کی عمارت کھڑی کردی۔اور اُس کے لئے سارا سامان بیرون ملک سے منگوایا۔جنگلی جانور پالے۔اپنے ذاتی استعمال کے لئے الگ سے ایک یوگ سنٹر (کٹیا) بنایا۔جس میں بیٹھ کر وہ کئی منٹوں تک سانس روک کر بیٹھ جاتا تھا۔یہ منظر میں نے خود کئی بار اُس کی کٹیا میں دیکھا ہے جہاں کسی عام شخص کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔دسمبر اور جنوری کی سخت سردی اور برف باری میں بھی وہ اپنے جسم پر صرف ململ کی ایک دھوتی اور پاؤں میں لکڑی کی کھڑاؤں پہن کر پورے آشرم کا چکر لگاتا رہتا۔میں جب بھی اپنے سسرال جاتا تو اُس کو ضرور ملتا ایک

بار میرے ساتھ پنجاب سے میرے دو دوست کہانی کار مختار گل اور فوٹو گرافر ہر بھجن باجوہ بھی تھے۔
اُس نے ہمیں دو دن ہوسٹل میں رکھا۔ گئو شالہ میں جرسی گائیں دکھائیں۔ عربی گھوڑے دکھائے۔
اپنے باغوں کے پھل کھلائے۔ مختار گل نے اُس کا تفصیلی انٹرویو کیا جو بعد ازاں پنجاب کے کئی پنجابی
اخبارات میں شائع ہوا۔ جس دن ہوائی حادثے میں اُس کی موت ہوئی، اُس دن میں لاٹی سے سُدھ
مہادیو کی طرف آرہا تھا اور میں نے مان تلائی سے دو کلومیٹر دور ایک موڑ سے جہاز کو درخت کے ساتھ
ٹکراتے ہوئے دیکھا۔ جہاز درخت سے ٹکرا کر گر گیا تھا۔ میں نے اپنے ڈرائیور کو آشرم چلنے کے لئے
کہا۔ جب میں وہاں پہنچا تو اس وقت آشرم کے ملازم دھریندر برہمچاری اور اُس کے پائلٹ کی لاش
اُٹھا کر لا رہے تھے۔ دو مہینے پہلے جب میں آخری بار اُس سے ملا تھا تو اُس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ
سیوج دھار پر ایک رسدگاہ بنانا چاہتا ہے۔ جہاں سائنس دان سیوج میں پائی جانے والی جڑی بوٹیوں
پر تحقیق کریں گے۔ پھر وہ مجھے درختوں کے بیچ ایک جگہ لے گیا جہاں اُس نے کنکریٹ کی ایک چھوٹی
سے غار بنائی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ یہ وہ جگہ ہے، جہاں اُس نے سمادھی لینی ہے۔ انسان سوچتا
کچھ ہے اور قدرت نے اس کے لئے کچھ اور سوچا ہوتا ہے۔ اُس کی موت کے بعد مان تلائی آشرم
کھنڈرات میں بدل گیا۔ سب ملازم چلے گئے۔ قیمتی سامان لوگ لوٹ کر لے گئے۔ عمارتیں سوگوار
کھڑی ہیں۔ باغات تباہ ہو چکے۔ جانور اور گھوڑے لوگ لے گئے۔ ٹرک اور کاروں کا کباڑ بن گیا۔
دھریندر برہمچاری کی جائیداد کو حاصل کرنے کے لئے کئی وارث جاگ پڑے۔ مقدمے بازی شروع
ہوگئی۔ آخر ریاستی سرکار نے مان تلائی آشرم کو ماتا ویشنو دیوی ٹرسٹ کی سپرداری میں دے دیا۔ میری
خواہش ہے کہ سرکار اس خوبصورت صحت افزا مقام کو سیاحوں کے لئے دوبارہ آباد کرے
۔ Infrastructure موجود ہے۔ صرف سرکار کے فیصلے کی دیر ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو پتنی ٹاپ
کے بعد مان تلائی جموں کا ایک اور بہترین صحت افزا مقام بن جائے گا۔

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں (حیرت آلہ آبادی)

اوتار سنگھ چندن: چندن سیدھا، سادھا، صاف، سُتھرا اور محبتوں کے ساگر سے پیار کے مٹکے بھر کر یار
بیلیوں کو میٹھا پانی پلانے والا شخص تھا۔ میری اُس کی گہری دوستی تھی۔ وہ ایک سفید پوش انسان تھا اور
اپنے خلوص کی وجہ سے سب کا پیارا تھا۔ میری اُس کے ساتھ پہلی ملاقات 1971ء میں پنجابی ساہت
سبھا سرینگر کے دفتر میں ہوئی تھی جہاں اُس نے ترنم میں اپنا ایک پنجابی گیت سنایا، جس میں پوٹھواری
الفاظ کا خوبصورتی سے استعمال کیا گیا تھا۔ گیت کے بول مجھے آج بھی یاد ہیں ؎

میرے ماہیا، ڈھول سپاہیا　　　جُل جُلیئے نی بارہ مُلے

اوتار سنگھ چندن ہر اتوار کو پنجابی ساہت سبھا کی ادبی نشست میں شامل ہوتا۔ اپنی نظمیں سناتا اور سبھا کے کام کاج میں بھر پور حصہ لیتا۔ سبھا کے نام نہاد دانشور اور گیانی اُسے ان پڑھ اور گنوار سمجھتے لیکن میری سوچ کے مطابق وہ ہم سب سے زیادہ پڑھا لکھا تھا۔ اُس نے بلھے شاہ کے ''الف'' کا سبق پیدا ہوتے ہی پڑھ لیا تھا۔ جبھی تو شاعری اُس کے اندر سے نکلتی تھی۔ گو اُس کی شاعری میں کہیں کہیں وزن بحر کی خامی تھی لیکن اُس کا تخئیل امیر تھا۔ اشعار میں روانی تھی اُسے ہر مشاعرے میں مدعو کیا جاتا۔ شاید اس کی شہرت سبھا کے ٹھیکیداروں کو ہضم نہیں ہوتی تھی۔ اوپر سے اس کا خوبصورت ترنم ___ چندن ایک یتیم بچہ تھا جس کے ماں باپ بہن بھائی اور باقی رشتے دار مظفر آباد میں 1947ء کے قبائلی حملے میں شہید ہو گئے تھے۔ حملہ آوروں سے بچتا بچاتا وہ اپنی دادی کے ساتھ مظفر آباد سے سری نگر آ گیا اور امیرا کدل کے نزدیک بندوق کی چھاوَنی'' کے ریفوجی کیمپ میں رہنے لگا۔ ڈوگرہ شاہی کے دور میں یہ جگہ ایک فوجی چھاوَنی تھی۔ شخصی راج ختم ہونے کے بعد عوامی سرکار نے یہاں مظفر آباد سے آنے والے ریفوجی سکھوں کو بسایا۔ چندن کی دادی نے اُسے بڑی مصیبتوں سے پالا۔ دراصل دادی کی سانسوں کی ڈور چندن کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ اوتار سنگھ کے والد کا پیشہ زرگری تھا۔ اس لئے دادی نے اُسے رشتے کے ایک چاچا کے پاس کام سیکھنے کے لئے بھیجا اور چند سالوں میں ہی وہ عمدہ کاریگر بن گیا اور چاچے کی دکان پر ہی کام کرنے لگا جو زینہ کدل میں تھی۔ لڑکپن سے ہی شاعری کی بیماری کی وجہ سے وہ اکثر دُکان سے غیر حاضر رہتا۔ جہاں کہیں بھی مشاعرہ ہوتا، وہ وہاں پہنچ جاتا۔ شادیوں میں سہرے پڑھتا۔ مذہبی مجلسوں میں نظمیں پڑھتا۔ ادبی اداروں میں اپنی روایتی شاعری سے سب کا دِل موہ لیتا۔ وہ اُردو، کشمیری اور پوٹھواری میں بھی اپنا کلام پڑھتا۔ دادی نے اُس کی شادی اپنی ہی برادری کی ایک لڑکی سے کروائی۔ اُس کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تو اُس کی بیوی نے اپنی بہن کا بیٹا گود لے لیا۔ اوتار سنگھ چندن نے اُس بچے کو پڑھایا اور روزگار کے قابل بنایا۔

فلم ایکٹر، دانشور اور ادیب بلراج ساہنی سے سرینگر میں میری پہلی ملاقات چندن نے ہی کرائی تھی۔ بلراج ساہنی چندنؔ کی پوٹھواری رنگ میں رنگی پنجابی شاعری اور اُس کی سادگی کا گرویدہ تھا۔ مشاعروں میں حصہ لینے کی وجہ سے وہ اکثر دکان سے غائب رہتا۔ گاہک کا کتنا بھی ضروری کام کیوں نہ ہو وہ اپنے اندر کے شاعر کی دلجوئی سے باز نہیں آتا اور سب کچھ چھوڑ کر مشاعرہ پڑھنے چلے جاتا۔ چندن کی اس عادت سے اُس کا چاچا بے حد دُکھی تھا۔ تنگ آ کر ایک دِن اس نے چندن کو کھری کھری

سُنا دیں۔ چندن دُکان سے اُتر کر سیدھا اپنے گھر آ گیا۔ جب پانچ سات دن وہ مجھے اور ہر بھجن سنگھ ساگر کو نہیں ملا تو ہم اُس کی خیریت پوچھنے اُس کے گھر گئے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ رونے لگا اور مجھ سے کہنے لگا کہ اُسے کسی کام پر مزدوری کے لئے رکھوا دے کیونکہ اُس نے چاچے کی دکان چھوڑ دی ہے اور وہ اب وہاں کام نہیں کرے گا۔ چندن جیسے کومل شاعر کو روتے دیکھ میرے دل کو ٹھیس پہنچی اور میں اُس کے لئے دکان ڈھونڈنے لگا۔ آخر ایک دوست کی وساطت سے بازار بٹہ مالو میں ایک خالی دکان مل گئی لیکن وہ اُس کی پگڑی مانگنے لگا۔ پگڑی دینے کے لئے ہمارے پاس پیسے نہیں تھے۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ اگر اُسکے بیٹے کو سرکاری نوکری دلائی جائے تو وہ دُکان بغیر بگڑی کرائے پر دینے کو تیار ہے۔ میں اُن دِنوں نائب وزیر اعلیٰ مرزا محمد افضل بیگ صاحب کا پرسنل اسسٹنٹ تھا۔ اس لئے نوکری دلوانے کا وعدہ کر کے دکان کی چابی چندن کے حوالے کر دی۔ دوسرے دن میں ہر بھجن سنگھ ساگر اور چندن بٹہ مالو گئے۔ دکان کھولی۔ اُس کی صفائی کی۔ اس کے پاس زرگری کے کچھ اوزار تھے اور باقی میں نے خرید کر لائے اور اپنی بیوی کا سارا زیور اُسے دیا تا کہ وہ اُسے ڈھال کر اپنا کام شروع کرے۔ ساگر نے بھی اُسے اپنی بیوی کے گہنے دیئے اور یہ طے ہوا کہ جب ہمیں ضرورت ہوگی تو وہ ہماری پسند کا زیور ہمیں بنا کر دے گا۔ کام کرتے دیکھ کر اس کے پاس گاہک آنے لگے۔ جب زینہ کدل میں لوگوں کو پتہ چلا کہ اصلی کاریگر چندن چاچے کی دکان چھوڑ کر اپنی دکان بٹہ مالو میں چلا رہا ہے تو وہ اپنے گہنے بنوانے کے لئے چندن کے پاس آنے لگے۔ صرافہ بازار کے ساہوکار بھی اُسے کام دینے لگے۔ اب یہ مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ چندن کو دکان پر ٹِک کر کیسے بٹھایا جائے۔ کہیں یہاں بھی وہ چاچے کی دُکان والی حرکتیں شروع نہ کر دے اور دکان بند کر کے مشاعرے پڑھنے نہ چلا جائے۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ دفتر سے چھٹی کے بعد ہم دو میں سے ایک ہر روز اُس کی دُکان پر بیٹھے گا تاوقتیکہ دکان بند کرنے کا وقت نہ ہو جائے۔ میں نے اپنے گھر سے دو کرسیاں اور ایک میز لا کر دکان پر رکھا تا کہ گاہک بیٹھ سکیں۔ وہ سونا دُکان پر نہیں رکھتا تھا بلکہ گھر لے جاتا تھا۔ ایک دن وہ کہنے لگا کہ اُسے ایک سائیکل کی ضرورت ہے۔ میں نے اُسے اپنا سائیکل دے دیا۔ چندن اچھی خاصی کمائی کرنے لگا۔ بٹہ مالو اور آس پاس کی بستیوں کا وہ ہر من پیارا سنیارا بن گیا بلکہ اُن کے گھریلو مسائل بھی حل کرنے لگا۔ وقت بڑا اچھا گزرنے لگا۔ پھر 1989-90 کا سال آیا۔ کشمیر میں بے چینی پھیلی۔ آزادی کے نعرے چاروں طرف گونجنے لگے۔ جنگجو اپنی کاروائیاں کرنے لگے۔ فوج دہشت گردوں کے خلاف کارروائی کرنے لگی۔ معصوم لوگ بھی مرنے لگے۔ ہڑتالوں اور کرفیو کی وجہ سے دکانیں بند رہنے لگیں۔ دُکاندار فاقہ

کشی کا شکار ہونے لگے۔ چندن نے دو تین سال دم رکھا لیکن آخر جموں آ گیا۔ یہاں آ کر اُس نے ایک چھوٹا سا مکان خریدا، جس کی رجسٹری کے لئے رقم میں نے دی۔ ایک دن وہ میرے پاس آیا۔ اُس کی حالت خراب تھی۔ بے بسی اور بے کسی اُس کے چہرے سے عیاں تھی۔ وہ کہنے لگا کہ جس گود لئے بیٹے کے لئے اُس نے ساری زندگی محنت کی، اس کی نوکری لگوائی، اس کو مکان بنا کر دیا، آج اُس نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ اس لئے اب وہ مرنا چاہتا ہے۔ میں نے اُس کا حوصلہ بڑھایا۔ اُسے لیکر اُس کے گھر گیا۔ اس کے بیٹے کو سمجھایا۔ ڈانٹا اور اُس سے معافی منگوائی اور چندن کو اُس کے گھر چھوڑ کر واپس چلا آیا۔ پھر ایک دِن مجھے ہر بھجن سنگھ ساگر کا فون آیا اس نے بتایا کہ اوتار سنگھ چندن یہ ظالم دُنیا چھوڑ گیا ہے۔ بھلا ایک حساس دل والا شخص اپنی اولاد کے ہاتھوں کب تک ذلیل ہوتا۔ وہ فوت ہو گیا اور اُس کے ساتھ میرے رشتے بھی فوت ہو گئے۔ دُعا گو ہوں کہ اللہ سائیں اُسے سورگ میں سکون عطا کرے۔ اُس کی بے چین روح کو شانتی ملے۔

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا کہیں زمیں تو کہیں آسماں نہیں ملتا (ندا فاضلی)

خالہ رضیہ: اپنی شادی کے بعد میں اکثر اپنی خوش دامن صاحبہ سے سنتا تھا کہ 1947ء کی شورش کے دوران ان کے کئی قریبی رشتے دار پاکستان چلے گئے تھے۔ میرے سسر کی سگی بہن وزیر بیگم اُستاد محلے کے نصیر الدین سلاریا کے ساتھ بیاہی گئی تھی۔ اُن کے چھ بچے تھے۔ چار بیٹے۔ نعیم، قمر، تصوّر اور عاشق۔ دو بیٹیاں پروین اور نگہت۔ یہ سارا کنبہ 1947ء میں سیالکوٹ ہجرت کر گیا اور پھر میر پور میں مستقل آباد ہو گیا۔ میری ساس کی پھوپھی اور پھوپھا حبیب اللہ جو 1947ء میں نارووال میں سرکاری نوکری کرتا تھا، وہ وہاں ہی رہا اور اپنے آبائی شہر جموں میں نہیں آیا۔ حبیب اللہ گلی کمہاراں، پرانی منڈی جموں کا رہنے والا تھا۔ اُس کے دو بیٹے عبدالرحمن اور عبدالسلام تھے اور چار بیٹیاں خالہ غلام فاطمہ (جو 1947ء سے پہلے ہی فوت ہو چکی تھی) خالہ رضیہ، خالہ ثریا اور خالہ زبیدہ دونوں وفات پا چکی ہیں) خالہ رضیہ کی شادی لاہور کے مسعود قریشی صاحب سے ہوئی تھی جو کہ ملازم تھے۔ لیکن اُنہیں فلمیں بنانے کا شوق تھا۔ اُنہوں نے اپنے ایک بیٹے طارق قریشی کے نام پر لاہور میں فلم کمپنی بنائی اور فلمیں بنانے لگے۔ انہوں نے کل تیرہ (13) فلمیں بنائیں۔ جن میں ''چوڑیاں''، ''سلاخیں'' اور ''دہلیز'' نے سلور جوبلی اور گولڈن جوبلی منائی۔ ان فلموں نے خوب بزنس کیا۔ اتنا پیسہ کمایا کہ مسعود قریشی صاحب نے پاش کالونی گلبرگ، سیکٹر ایل میں دو کنال کی ایک کوٹھی خریدی۔ ان کے تین بیٹے شاہد، طارق اور زاہد ہیں۔ چار بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں۔ 1985ء میں میری ساس،

سُسر اور بیٹی سمعیہ تبسم ایک مہینے کے ویزے پر لاہور گئے اور خالہ رضیہ کے ہاں ٹھہرے اُن کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ لاہور اور سیالکوٹ کی سیر کرائی گئی۔ جب وہ واپس آئے تو خالہ رضیہ کی مہمان نوازی کے قصیدے پڑھتے رہے۔ خالہ رضیہ نے اپنی دونوں بہنوں ثریا خالہ اور زبیدہ خالہ کی پرورش کی۔اُن کی شادیاں کرائیں خالہ زبیدہ کی بیٹی شیریں بہن کی شادی سیالکوٹ میں کرائی اور خالہ ثریا کی بیٹی گوگی بہن کی شادی اپنے بیٹے زاہد قریشی سے کرائی۔ وہ دونوں بہنوں کی کفالت بھی کرتی رہی۔اُس کی زندگی میں ہی دونوں بہنیں اللہ کو پیاری ہوگئیں اور ان کے جنازے گلبرگ سے ہی نکلے۔ 2004ء میں عالمی پنجابی کانفرنس میں حصہ لینے کے لئے جب میں لاہور جارہا تھا تو میری ساس نے مجھ سے کہا کہ میں اُن کی بہن خالہ رضیہ کے گھر ضرور جاؤں۔اُنہوں نے مجھے اُنکا فون نمبر بھی دیا۔لاہور میں ہمیں ''شاہ تاج'' ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ میرے ساتھ گورداسپور سے پرنسپل اوتار سنگھ سدھو اور بیپابلونت بھی تھے۔ کانفرنس کے تیسرے اور آخری دن میں نے خالہ رضیہ کو فون کیا اور اپنا تعارف کرایا۔ اور لاہور آنے کا اپنا مقصد بتایا۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر زاہد بھائی اور اُن کے کزن جاوید بھٹ صاحب مجھے لینے ہوٹل پہنچ گئے۔ میں اُن کے ساتھ خالہ کو ملنے گلبرگ گیا۔ میرے ساتھ پرنسپل اوتار سدھو اور بیپابلونت بھی تھے۔ وہاں خالہ رضیہ کی بہنوں خالہ ثُریا اور خالہ زبیدہ سے ملاقات ہوئی۔ اُن کے علاوہ خالہ کے بیٹے طارق بھائی اُن کے بیوی بچوں اور زاہد بھائی کے عیال سے ملے۔ زاہد بھائی کے بیٹے حسن، مدثر اور عمیر نے پیار اور خلوص سے ہماری خدمت کی۔ شام کو ہم واپس ہوٹل آ گئے۔ اگلے دِن عیدِ قربان تھی۔ خالہ رضیہ نے بریانی اور سالن کے دو بڑے بڑے پتیلے ہوٹل بھجوادیئے اور ہم سب بھارتی ڈلی گیٹوں نے بریانی کھائی اور عید منائی۔ دوسری بار میں خالہ رضیہ اور ان کے اہل خانہ سے 2005ء میں ملا جب میں ہندوستان اور پاکستان کی سرکاروں کے باہمی سمجھوتے کے مطابق پرمٹ سسٹم کے ذریعہ ''کاروانِ امن'' بس میں سری نگر سے مظفر آباد گیا تھا۔ میرے ساتھ میری بیگم نسیم فردوس بھی تھی۔ مظفر آباد سے راولپنڈی چکلالہ ڈاکٹر کرنل عنایت حسین اور بہن ڈاکٹر پروین کے ہاں ٹھہرے جو میری اہلیہ کی پھوپھی زاد بہن ہے۔ وہاں سے میر پور گئے اور پھر میر پور سے لاہور آ گئے، جہاں میں عالمی پنجابی کانفرنس میں ایک ڈلیگیٹ کے طور پر شامل ہوا اور جہاں میری کتاب ''ہلدی برف داسیک'' کی رسم اِجرا ہوئی۔ پھر ہم خالہ رضیہ کے ہاں آ گئے۔ جہاں ہم نے چار دِن قیام کیا اور جموں سے ہجرت کرکے آئے اور لاہور میں آباد کئی لوگوں کو ملے۔ بھائی جاوید بٹ، بھائی عامر اور بہن غزالہ کے ہاں کھانا کھایا۔ بھائی خالد بٹ کے ہاں گئے۔ عامر اور خالد

بٹ خالہ رضیہ کے داماد ہیں۔ اُن کے بچوں سے ملے۔ خالد کی محبت اور شفقت اور مہمان نوازی کا لطف اُٹھایا۔ زاہد بھائی کے بڑے فرزند حسن کو ساتھ لیکر سارا لاہور شہر دیکھا۔ خالہ رضیہ ایک جہاں دیدہ خاتون تھیں، ایک قابل احترام شخصیت۔ اُنہوں نے زندگی میں کئی اُتار چڑھاؤ دیکھے۔ اچھے، بُرے دِن دیکھے لیکن اپنی حکمت عملی اور دانش مندی سے پورے کُنبے کو جوڑے رکھا۔ مجھ پر اُن کی شفقت اتنی زیادہ تھی کہ ہر پل بہن گوگی سے کہتی کہ خالد حسین نے ناشتہ کیا؟ کھانا کھایا؟ اُسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ زاہد بھائی کو بار بار کہتی کہ خالد کا خیال رکھے۔ پھر میں تقریباً اُن کو ہر سال ملتا رہا، اور اُن کا پیار اور خلوص حاصل کرتا رہا۔ 2011ء میں، میں خصوصی طور پر زائد بھائی کے بیٹے حسن کی شادی میں شمولیت کے لئے گیا تھا۔ میرے ساتھ میری بیگم اور بڑی بیٹی سمعیہ بھی تھی۔ شادی کی گہما گہمی کے باوجود خالہ رضیہ ہمارے بارے میں فکرمند رہتی کہ کہیں مہمان نوازی میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ 2014ء میں، میں پھر لاہور گیا اور خالہ رضیہ کے ہاں ٹھہرا۔ میرے ساتھ میرا بڑا داماد انجینئر محمد ایوب وانی، میری چھوٹی بیٹی ڈاکٹر ہما تبسم، میری بڑی بہو مرحومہ فرحت بانو اور اُس کی دو بیٹیاں اور میری پوتیاں زارا اور رمشا تھیں۔ ہم سب زارا کو چھوڑنے گئے تھے جو سارک کانفرنس کے سمجھوتے کے تحت ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کورس کے لئے منتخب ہوئی تھی۔ 2018ء میں عالمی پنجابی کانفرنس کے وقت وہ کافی علیل تھیں پھر بھی میرے لئے فکرمند رہیں۔ 2019ء میں جب میں لاہور گیا تو وہ بہت زیادہ بیمار تھیں۔ زبان لگ بھگ بند ہو چکی تھی اور عمر بھی 90 سال تھی لیکن پھر بھی اشاروں سے مجھے اپنے پاس بٹھانا اور اپنے سامنے ناشتہ اور کھانا کھلانا۔ اُن کی بہو بہن گوگی اور حسن کی بیوی اور ہماری بیٹی مریم نے خالہ رضیہ کی جی جان سے خدمت کی۔ جب میں واپس جموں آیا تو کچھ عرصہ کے بعد زاہد بھائی نے اُن کی وفات کی خبر سنائی۔ اللہ میری خالہ کو غریقِ رحمت کرے۔ جب میں فروری 2020 میں لاہور گیا تو زاہد بھائی کے ساتھ خالہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گیا۔ گلاب کی پتیاں اُن کی قبر پر نچھاور کیں۔ آج گلبرگ والا مکان بک چکا ہے اور بھائیوں نے الگ الگ کوٹھیاں بنالی ہیں۔ میری دُعا ہے کہ سبھی بھائی بہنوں میں پیار بنا رہے۔ محبت اور خلوص قائم رہے تاکہ میری خالہ کی رُوح پُرسکون رہے۔ جنت مکانی خالہ رضیہ کی محبت اور شفقت کی یادیں ہمیشہ میرے اندر زندہ رہیں گی۔

مجھ کو خوشی ملی تو زمانے میں بانٹ دی اور غم ملا تو اپنے ہی گھر لے کے آ گیا (نامعلوم)

☆☆☆

2024 ke fiction aur fiction tanqeed ka jaeza by Prof. Aslam Jamshedpuri

(HOD Urdu C.C.S.University Meerut) cell-9456259850, 8279907070

پروفیسر اسلم جمشید پوری (صدر شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)

۲۰۲۴ کے فکشن اور فکشن تنقید کا جائزہ

۲۰۲۴ رخصت ہوگیا ہے اور ۲۰۲۵ ہمارا استقبال کر رہا ہے۔ کائنات کے اس طویل سفر میں دھول کا ایک اور ذرّہ ہوا کی نذر ہو گیا ہے۔ ۳۶۵ دن کے سال کے دوران کچھ یادگار لمحات ہوتے ہیں، جن کی بدولت ہم کسی سال کو یاد کرتے ہیں۔ جنوری سے دسمبر ۲۴ میں جو ادبی اتھل پتھل ہوتی ہے اس کا ایک جایزہ، وہ بھی یہ جایزہ صرف فکشن (ناول، ناولٹ، افسانہ، افسانچہ) اور فکشن تنقید کا جایزہ تک محدود ہے۔ آپ کی دلچسپی کے لئے پیشِ خدمت ہے۔ اس کو پڑھ کر آپ کو سال گذشتہ میں فکشن کی رفتار اور معیار کا علم ہوگا۔

اس بار کئی اہم افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ ''جب تک ہے زمیں'' ڈاکٹر ناصر عباس نیر کا چھٹا افسانوی مجموعہ ہے۔ وہ ایک اعلیٰ پائے کے محقق اور ناقد ہیں۔ وہ 'مابعد جدید نوآبادیاتی مطالعے' کے بنیاد گذار ہیں۔ ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور کئی قابلِ فخر انعامات مل چکے ہیں۔ ایسے بہت ہی کم لوگ ہیں جو تحقیق و تنقید کے ساتھ ساتھ فکشن اور فکشن تنقید بھی لکھتے ہوں۔ وزیر آغا اور انور سدید کے بعد ناصر عباس نے تحقیق و تنقید کا علم بلند رکھا ہے۔ مغرب کی نئی تھیوریز ہو یا مشکل اصطلاح، ناصر عباس نے اپنے مطالعے اور رویے سے اسے آسان بنا دیا ہے۔

ناصر عباس نیر نے لیک سے ہٹ کر افسانے لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں میں انسان کی نفسیات کا گہرا مطالعہ اور معاشرے میں روز بہ روز آنے والا تغیر افسانوی رنگ میں ملتا ہے۔ مذکورہ مجموعے میں ۱۶ افسانے شامل ہیں۔ ان میں سے بعض افسانے سماج کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھتے ہیں۔ ان کے افسانے اپنے ملک کی سیاسی، سماجی، اقتصادی اور ادبی صورتِ حال کا بہت اچھا بیان ہیں۔ کچھ افسانے مثلاً گڑ اور گولیاں، چائے کا ایک کپ اور چمڑے کا ایک پاؤچ، نطشے اور مریل گھوڑا، پہلے کھیل اور بعد میں لکھی گئی تمثیل، اپنے ماضی کے خدا، تو آج کی افسانے روایت میں اضافے کا درجہ

رکھتے ہیں۔

''زندگی کا بازار'' لے کر کشمیر سے ڈاکٹر ریاض توحیدی آئے ہیں۔ یہ ایک ایسا بازار ہے جو بڑا عجیب و غریب ہے۔ ویسے تو یہ ریاض توحیدی صاحب کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ پتہ نہیں کیوں اس پر مرتب کی حیثیت سے انور مرزا کا نام ہے، جبکہ اندران کا ایک حرف بھی (مقدمہ وغیرہ) نہیں ہے۔

اس مجموعے کے نام کے نیچے ''مابعد جدید افسانوں کا انتخاب'' لکھا ہوا ہے۔ اس جملے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ ریاض توحیدی کے افسانوں کو تیسرا مجموعہ نہیں، بلکہ ان کے تمام افسانوں کا انتخاب ہے۔ اس میں ان کئی پرانے افسانے بھی شامل ہیں۔ یہ سبھی افسانے اپنے عصر کی آواز ہیں۔ خاص کر کشمیریوں کی زندگی، ان کے سیاسی اور سماجی مسائل و معاملات، دہشت گردی اور خوف و ڈر کی کہانی موجود ہے۔ ریاض توحیدی کے معروف افسانوں میں جشنِ قبرستان، کالی دھند اور سفید کبوتر، جنت کی چابی، دردِ کشمیر، ناقوس و اذان، زندگی کا بازار، سنگ باز، ہوم لینڈ، گلوبل جھوٹ، ہائی جیک، کالے پیڑوں کا جنگل، کبوتر اور سانپ، کشمیر نواز وغیرہ شامل ہیں۔

ان کے اس مجموعے کا ٹائٹل افسانہ 'زندگی کا بازار' ہے۔ جس میں ایک پھیری والے کا کردار ہے، جسے لڑکوں بچوں، سب سے بڑا پیار ہے۔ وہ اپنی گٹھری میں طرح طرح کی چیزیں رکھتا ہے۔ کوئی بچہ اگر بغیر پیسے کے بھی کچھ لے لیتا تو وہ کچھ نہیں بولتا۔ وہ ایسی جگہ رہتا تھا جہاں ہر چیز خالص ملتی۔ جہاں کی آب و ہوا بھی نہایت صاف ستھری تھی جبکہ کشمیر کے بہت سے علاقوں میں ملاوٹ عام تھی۔ کوئی بھی چیز خالص نہیں تھی۔ یہاں زندگی کا ہر آرام اور آسائش موجود تھی، کیا اے سی، کمپیوٹرس، موبائل، انٹر نیٹ، بڑے بڑے محلات، قیمتی گاڑیاں، اولڈ ایج ہاؤس سب کچھ موجود تھا لیکن سکون نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کا ایک جملہ تو مصنف کو بہت پریشان کرتا تھا ''زندگی کی سب دکانیں بند ہیں اس شہر میں''۔

دراصل اس افسانے میں قدیم اور جدید زندگی اور ماحول کا تقابل کیا گیا ہے جس کے لئے مصنف نے پھیری والے کو واسطہ بنایا ہے۔ جس کی زندگی بظاہر کوئی آرام نہیں مگر اس کے پاس ہر چیز میں شفافیت ہے۔ اس کی زندگی میں سکون ہے۔ اور جدید عہد میں ہر طرح کی سہولتیں ہونے کے باوجود سکون نام کو نہیں ہے اور یہ کسی دکان یا بازار میں نہیں ملتا۔

ایم اے کنول جعفری کا تازہ افسانوی مجموعہ ''زخمی روح'' ابھی ابھی شائع ہوا ہے۔ کنول جعفری ایک با مقصد افسانہ نگار ہیں۔ ان کی تحریر میں سماج کے لئے ایک پیغام ملتا ہے۔ ان کا نظریہ اصلاح پسند ہے

۔وہ موجودہ سماج کی سرگرمیوں سے پریشان ضرور ہیں لیکن مایوس نہیں۔آج جو ہر طرف نفرت کا زہر پھیلا ہوا ہے،جس نے انسانیت کو خانوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا ہے۔سماج کی یہ تقسیم امیر اور غریب کی سطح پر نہیں ہے بلکہ یہ مذہب کی بنیاد پر ہے جو روز بہ روز سماج اور معاشرے کو اندر اندر کھوکھلا کر رہی ہے۔

ایم اے کنول جعفری کے اب تک دو افسانوی مجموعے''چاک کا بوسیدہ ٹکڑا''اور''خاموش لب''شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ان کی افسانہ نگاری مقصدی ہے وہ افسانہ نگاری سے صحت مند معاشرے کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔وہ سماج میں اسلام کی قدریں عام کرنا چاہتے ہیں۔اس لئے ان کے ہر افسانے میں اچھی باتوں کی تلقین ہوتی ہے۔ان کی افسانہ نگاری کے تعلق سے معروف افسانہ نگار اور ناقد ڈاکٹر عبیداللہ چودھری رقم طراز ہیں۔

''ایم اے کنول جعفری اپنی بعض کہانیوں کے ذریعہ اعلیٰ اخلاقی قدروں کی پاسداری کرنے کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے انہیں قدروں کو اپنی زندگی میں برتا ہوگا۔''

ایم اے کنول جعفری کے کئی افسانے خاصے مقبول اور اہم ہیں۔مثلاً چاک کا بوسیدہ ٹکڑا، خاموش لب ،ایثار، دھندے سے جڑے لوگ ،زخمی روح ،شریف لوگ ،پتھر کے آنسو، گئو رکھشک ، پربھوداسی ،حویلی کی چڑیا پیٹھ پر سوتیلا بوجھ وغیرہ۔زخمی روح میں انہوں نے نوٹ بندی کے وقت گاؤں دیہات کے سیدھے سادے لوگوں کو درپیش مسائل کو رام دیال کے اعلیٰ کردار کے توسط سے پیش کیا ہے ۔جس نے اپنی زندگی میں دوسرے کسانوں کی ہر ممکن مدد کی۔ایک ہائی وے جام اور بھگدڑ میں رام دیال کی موت واقع ہو جاتی ہے۔بیٹوں کی محبت ، پولس کی بے حسی اور فضل الرحمٰن کی دوستی کو اس افسانے میں عمدگی سے پیش کیا ہے۔افسانے کا اختتام مقصدیت کی نذر ہو گیا ہے۔

''روشنی کی نئی کرن''شمشاد جلیل شاد کے افسانے اور افسانچوں کا مجموعہ ہے۔شمشاد جلیل شاد کا انتقال کووڈ کے پہلے دور میں ۹ اپریل ۲۰۲۱ میں ہوا۔وہ سہ ماہی''اسباق''کی نائب مدیرہ تھیں۔اچھی شاعرہ بھی تھیں۔ان کی موت کے بعد ڈاکٹر ترنم نے اِدھر اُدھر پڑے ان کے افسانوں اور افسانچوں کو جمع کیا اور انہیں کتابی شکل میں مرتب کیا۔

شمشاد جلیل شاد کی اس سے قبل کئی کتابیں ،پہلی دھوپ کا سایہ، پونے میں اردو صحافت ،نعتیہ ماہیے رحمتِ عالم ،نذیر فتح پوری کے روبرو، نذیر فتح پوری شہر سخن کا مسافر، کیسر کی مہک (ہندی میں) شائع ہو چکی ہیں۔آپ کے اور ڈاکٹر ترنم کے تعلق سے ڈاکٹر نذیر فتح پوری لکھتے ہیں۔

''شاد صاحبہ ایک مخلص خاتون تھیں۔خود کو پیچھے رکھ کر دوسروں کو آگے بڑھانے کا ان کا جذبہ قابلِ ستائش تھا۔آج کے زمانے میں ایثار کا ایسا جذبہ کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ڈاکٹر ترنم سے ان کا ادبی رشتہ تو تھا ہی،دونوں شخصی طور پر بھی ایک دوسرے کے قریب تھیں۔''[روشنی کی نئی کرن ،ص۔۵،اسباق پبلی کیشنز،پونے]

شمشاد جلیل شاد کا اہم افسانہ'' روشنی کی کرن'' ہے۔یہ کتاب کا ٹائٹل افسانہ ہے۔اس افسانے میں اپنوں کی غیریت اور غیروں کی اپنائیت دکھائی ہے،کس طرح اپنے بچے باہر ملک چلے جاتے ہیں اور ان کی نظر صرف جائداد پر ہوتی ہے۔بلآخر وہ ماں کے ارمانوں کے گھر کو فروخت کر دیتے ہیں۔اور ان کی نوکرانی کی بیٹی انہیں اپنے گھر میں،جبت سے رکھتی ہے۔بڑا جذباتی افسانہ ہے۔

تاج الدین محمد کا پہلا افسانوی مجموعہ'' خدا کے گھر کا بٹوراہ'' ابھی شائع ہوا ہے۔اس میں تقریباً ۲۵ افسانے شامل ہیں جو افسانہ نگار کے فن اور خیال وفکر کو پیش کرتے ہیں۔تخلیق کار کے اندر معاشرے کی مثبت اقدار کی طرح جھکاؤ زیادہ ہے۔اسے اسلام کی باتیں جو اخلاق وکردار کو بہتر بناتی ہیں،سے بھی لگاؤ ہے۔قرآن اور نماز سمجھ کر پڑھنے پر ان کی توجہ زیادہ ہے۔یہ تمام باتیں ان کے افسانوں کہیں بلواسطہ اور کہیں بلاواسطہ درآئی ہیں۔ان کے اچھے افسانوں میں،پنچر والا،خدا کے گھر کا بٹوارہ،اپاہج نصیبوں جلی،بازگشت،موت کے سوداگر،رحم دل بوڑھا،سوروپے کا نوٹ کا شمار ہونا چاہیے۔

ان کا افسانہ'' خدا کے گھر کا بٹوارہ'' ہے۔اس میں انہوں نے کوشش کی ہے کہ وہ اسلام کے اندر کی تفریق کو پیش کریں۔مسجدوں کی تقسیم ان کے دل پر کاری ضرب لگاتی ہے۔دیوبندی مسجد اور بریلوی مسجد۔۔افسانہ نگار کا دل اس تفریق کے لئے کڑھتا ہے۔وہ قریب کی ہی مسجد میں نماز ادا کر لیتا ہے۔ان کا ماننا ہے کہ یہ سب مولویوں نے کیا ہے۔افسانہ تو ختم ہو جاتا ہے۔مگر جہاں عام قاریوں کے لئے سوال چھوڑ جاتا ہے،ناقدین کے دل میں بھی سوال اٹھتا ہے کہ یہ کیا افسانہ ہوا؟اس میں تحیر وتجسس کہاں ہے؟ کلائمکس کیا ہے؟

نشاط پروین کا پہلا افسانوی مجموعہ'' رانگ نمبر'' تازہ تازہ وارد ہوا ہے۔اس میں ان کے بتیس افسانے شامل ہیں۔ان میں کوئی بڑا فلسفہ نہیں ہے۔یہ کسی بڑی بحث کا آغاز نہیں کرتے مگر یہ نشاط پروین کے افسانے ہیں۔یہ ہمیں چونکاتے ہیں،غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ان افسانوں میں بہت سے واقعات،کردار اور مناظر جانے پہچانے لگتے ہیں۔یہ سب ہمارے سماج کا ہی حصہ ہیں۔ان میں عام انسانوں کا درد ہے،کرب ہے،جذبات ہیں تو ان کی خوشیاں اور غم ہیں،جو افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ

پڑھنے والے پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔

افسانہ ’’رانگ نمبر‘‘ ایک اچھا افسانہ ہے۔اس میں افسانہ نگار نے اپنوں کے رنگ بدلنے کی بہترین عکاسی کی ہے۔ایک بیٹا جو پڑھنے کے لئے باہر جاتا ہے۔ پڑھائی کے وہیں شادی کر لیتا ہے۔گھر سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہتا۔عرصہ بعد پوتی کا فون آتا ہے اور وہ دادا دادی کو دہلی اپنے گھر بلاتی ہے ۔بیٹے سے بھی بات ہوتی ہے۔وہ لوگ بیٹے اور پوتی کی محبت میں دہلی کا سفر کرتے ہیں۔اسٹیشن پر بیٹے کو رسیو کرنا تھا۔وہ ٹریفک میں پھنسنے کا کہتا ہے۔دونوں میاں بیوی گھنٹوں انتظار کرتے رہتے ہیں۔وہاں عورت کی طبعت خراب ہو جاتی ہے۔بہو کو فون کرنے پر ’رانگ نمبر‘ ہونے کی اطلاع ملتی ہے۔اسٹیشن ماسٹر انہیں واپسی کی ٹرین میں بٹھا دیتا ہے۔ٹرین چل پڑتی ہے تو بیٹے کا فون آتا ہے ۔’رانگ نمبر‘ کہہ کر باپ فون کاٹ دیتا ہے۔ بڑا ہی جذباتی قسم کا افسانہ ہے۔

’’انتظار۔اب دریچوں سے نہیں جھانکتا‘‘ سیدہ ایمن کا افسانوی مجموعہ ہے۔اس مجموعے کی خوبی یہ ہے کہ اس افسانوی مجموعے میں مذہبی رنگ بڑا واضح ہے۔یہ سبھی افسانے اخلاقی درس کے حامل ہیں۔ سیدہ ایمن کا مقصد معاشرے میں مثبت قدروں کو عام کرنا ہے۔مجموعے کا ٹائٹل افسانہ ’’انتظار۔۔‘‘ ہے۔جو ایک مشہور اسپتال کی کہانی ہے۔اسپتال والوں نے دس سال کے بچے کو کینسر ہونے کا اعلان کر دیا۔جسے بچے کے گھر والے خاص کر اس کے والد بالکل ماننے کو تیار نہیں۔اور شور شرابہ کرتے ہیں۔کہیں اور ٹیسٹ کرانے کی بات کرتے ہیں۔اسپتال کی مالک ڈاکٹر نشاط بچے کے والد کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں یہ باور کرانے کی کوشش کرتی ہے کہ موت کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔وہ کسی بھی عمر میں آسکتی ہے۔بس یہی افسانے کا حاصل ہے۔

نجم باگ کے دو دو افسانوی مجموعے ’’وفور‘‘ اور ’’مکافات‘‘ ایک ساتھ ۲۴ میں شائع ہوئے ہیں۔ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ ایک ہی افسانہ نگار کے دو مجموعے ایک ساتھ شائع ہوئے ہوں۔نجم باگ کا تعلق گلبرگہ سے ہے۔نجم باگ بہت زمانے سے افسانے لکھ رہے ہیں، لیکن یہ افسانے اب مجموعے کی شکل میں آئے ہیں۔اسی لئے ان کا رنگ بھی جدیدیت والا ہے۔ان میں بہت سی سطریں منظوم ہیں۔یہ افسانے کے مکالمے ہیں۔ان سے افسانے کی تاثیر میں کوئی فرق نہیں پڑتا، ہاں ان سے افسانوں کا لب ولہجہ اور اسلوب کا پتہ چلتا ہے۔

دونوں مجموعوں کے افسانے (مکافات۔۱۹ افسانے۔وفور۔۱۹ افسانے) میں ۷۵ فی صد افسانوں میں نظمیہ طریقہ اپنایا گیا ہے۔کئی افسانے تو نظم ہی ہیں۔یہ ہوسکتا ہے جدت ہو؟ اس زمانے میں ایسے

افسانے یا تو بہت زیادہ پرانے ہیں یا پھر یہ افسانے بہت زیادہ جدید۔ان میں ہوسکتا ہو کوئی بہت بڑا فلسفہ چھپا ہو۔وفور ۱۵۲ صفحات پر پھیلا ہے۔اس میں بھی ۱۹ افسانے مشکل سے سوصفحات میں پھیلے ہیں۔یہی معاملہ ُمکافات‘ کا بھی ہے۔یعنی دونوں مجموعوں میں تقریباً ۲۰۰ صفحات میں ۳۸ افسانے شامل ہیں۔دونوں مجموعوں کے افسانے ایک ہی مجموعے میں آسکتے تھے۔پھر دو مجموعے لانے کا کیا مقصد؟

’’شکوہ ،جوابِ شکوہ‘‘راقم کا افسانوی مجموعہ ہے ۔یہ پانچواں افسانوی مجموعہ ہے ۔اس کا دوسرا ایڈیشن بھی اسی سال اپریل میں شائع ہوا۔اس کے سارے افسانے حضور کی سیرت اور قرآنی قصوں اور آیات پر مبنی ہیں۔

’’رقصِ شعلہ‘‘سہیل ارشد کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔جس میں کل ۱۱ افسانے ہیں۔دو افسانہ نگار فیروز عابد اور انیس رفیع اور ایک ناقد و ڈرامہ نگار ظہیر انور کا مضمون ہے۔جن سے سہیل ارشد کے افسانوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔دراصل سہیل ارشد کے بعض افسانوں کو سمجھنا آسان نہیں۔ان میں علامتیں،استعارات اور تمثیل پائی جاتی ہے۔ایسے افسانے جدیدیت کی یاد تازہ کرتے ہیں۔اس عہد کے بیشتر افسانوں میں جس طرح ثقیل علامتوں اور مشکل ترین اسلوب کا گذر ہوتا ہے کہ قصہ پن کہیں اندر گم ہوجاتا ہے۔سہیل ارشد کی بھی کئی افسانے علامتی ہیں۔جن کا نمائندہ افسانہ رقصِ شعلہ ہے۔گو کہ انیس رفیع نے اس افسانے کو سمجھانے کی حتی الامکان کوشش کی ہے،لیکن یہ افسانہ عام قاری کے لئے ذرا مشکل ہے۔سہیل ارشد کے کچھ افسانے بہت خوبصورت ہیں جو ہندوستان کے نشیب وفراز یعنی زندگی کو بہتر طور پر پیش کرتے ہیں۔ایسے افسانوں کا نمائندہ افسانہ’’پنجرہ‘‘ہے،جو غلامی کی واضح علامت ہے۔یہ افسانہ باپ بیٹی کے مکالموں اور غلامی اور آزادی کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔

’’روشنان‘‘ ڈاکٹر فریدہ تبسم کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے ۔ڈاکٹر فریدہ تبسم گلبرگہ کی معروف افسانہ نگار ہیں۔ان کے افسانوں میں خواتین کے حقوق کی بازیافت ہے ۔ملک میں پھیلتا نفرت کا زہر ،انسان خاص کر مرد کردار کا بے کردار ہونا،عورتوں کا آزادی کا غلط استعمال ،سماج میں ہونے والی عجیب وغریب حرکات وسکنات ،رشتوں کی پامالی اور ان کا کھوکھلا پن ،مذہب کی بے اثر باتیں،انہیں پریشان کرتا ہے۔وہ مذکورہ باتوں کو موضوع بناکر افسانے قلم بند کرتی ہیں۔

مذکورہ مجموعے میں ان کے اٹھارہ افسانے شامل ہیں۔ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر ریاض توحیدی ،ڈاکٹر محمد شارب ،ڈاکٹر رحمت عزیز خان چترالی کے مضامین اور خود کا مضمون شامل ہے۔کتاب کے آخر میں

افسانہ نگاعر کے سوانحی کوائف بھی درج ہیں۔آتش کدہ، میری عیدی، جہانِ عشق، زندگی دھوپ۔۔تم گھنا سایہ،کوزہ گر، گرودکھشنا کوضرور اچھے افسانوں میں شمار ہونا چاہیے۔ان کے افسانوں میں رومان کی ترنگیں بھی ملتی ہیں جوقاری کیاندربھی سرایت کر جاتی ہیں۔ان کا افسانہ قاریکواپنی کہانی لگنےلگتی ہے۔ان کے افسانوں کے اسلوب سے متعلق ڈاکٹر رحمت عزیز خان کتاب کے فلیپ پر لکھتے ہیں۔

''انہوں نے سادہ بیانیہ کے علاوہ، نیم علامتی، تجریدی، انداز اورداستانوی اسلوب، خطوط، اورڈائری نمااور سائنسی

فکشن وغیرہ اسلوب میں افسانے تخلیق کئے ہیں۔یعنی آسمانِ تخلیق پر روشنان کی دھنک بن گئے ہیں۔''

''پیاسے لوگ'' ممتاز شارق کا پہلا افسانوی مجموعے کا دوسرا ایڈیشن ہے۔پہلا ایڈیشن آج سے تقریباً ۳۸ برس قبل ۱۹۸۶ میں شائع ہوا تھا۔اس دوسرے ایڈیشن میں ممتاز شارق نے کچھ نئے افسانے اور افسانچوں کا اضافہ کیا ہے۔اس میں پہلے ایڈیشن کے ناشر تنویر اختر رومانی کی تحریر اور رضوان واسطی کا دیباچہ شامل ہے۔اس مجموعے میں کل ۲۲ افسانے، ۱۰ افسانچے اور پہلے ایڈیشن پر ۱۸ لوگوں کی آرا بھی ہیں۔ان کے زیادہ تر افسانوں کی کہانیاں اور کردار بلکہ مقامات بھی آس پاس کے ہیں۔ان میں آج سے تیس چالیس برس پہلے کے معاملاتِ زندگی ہیں۔سماج کا اثر دار اور مالدار شخص جوکھیا، ٹھیکے دار، سیاست داں کچھ بھی ہوسکتا ہے جوسماج کے دبے کچلے لوگوں پر ظلم کرتا ہے۔افسانہ 'پیاسے لوگ' بھی اسی قسم کا افسانہ ہے۔ممتاز شارق کے افسانچے سماج پر گہرا طنز کرتے ہیں۔

'یہ کہانی نہیں ہے' معروف ومقبول فکشن نگار ڈاکٹر احمد صغیر کے افسانوں کا چھٹا مجموعہ ہے۔اس سے قبل وہ کئی تنقیدی کتب اور ناول دے چکے ہیں۔افسانوں کی بات کی جائے تو ان کا پہلا مجموعہ 'منڈیر پر بیٹھا پرندہ' ۱۹۹۵ میں منظر عام پر آیا۔اس کے بعد یکے بعد دیگرے ان کے پانچ افسانوی مجموعے، اناّ کو آنے دو، درمیاں کوئی تو ہے، داغ داغ زندگی، کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے، شائع ہوئے۔آج ان کا شمار سینئر افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کا افسانوی مجموعہ' کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے، اردو میں دلتوں کی زندگی اور مسائل پر اردو کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔

'یہ کہانی نہیں ہے' میں احمد صغیر کے ۲۴ افسانے، غیر مطبوعہ ناول کا ایک باب اور احمد صغیر کے فن پر ناقدین کی آراء شامل ہیں۔احمد صغیر آس پاس سے کہانی اٹھاتے ہیں۔ان کے افسانوں میں عصریت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔مجموعے کے ٹائٹل افسانے میں بھی انہوں نے عصریت کومختلف انداز

میں پیش کیا ہے۔ایک کہانی کار، جادوگر، شہراور رات اس کہانی کے اہم اجزاء ہیں۔این آر سی اور شہر کے نام بدلنے کو بھی طنزاً پیش کیا گیا ہے۔جادوگر ہی کہانی کار ہے جو سب کچھ بدل کے رکھ دیتا ہے ۔اس مجموعے کے دیگر اچھے افسانوں میں جموا، یہ دیوار بھی گرے گی ،لہورنگ تصویر،فریم سے باہر کی تصویر، بازار، برادری، بساط کا شمار ہونا چاہیے۔آنے والے ناول ''خواب تماشا'' کا ایک دلچسپ باب بھی کتاب میں شامل ہے۔

''شطرنج کی بازی'' پٹنہ کی رمانہ تبسم کا دوسراافسانوی مجموعہ ہے۔ان کا پہلا مجموعہ' گذشتہ سالوں منظر عام پر آیا۔شموئل احمد کے ساتھ ان کی ایک کتاب 'اردوافسانے کی بے وفاعورتیں' نے کافی شہرت پائی تھی ۔ان کے افسانے سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ان میں کوئی بہت گہرا فلسفہ، یا کسی بہت بڑے رجحان کے تحت نظر نہیں آتے۔وہ عام سے واقعات کو کہانی بنادیتی ہیں۔ان کے افسانے سماج میں پھیلے ناسور کے مظہر ہیں۔اس مجموعے میں ان کے پندرہ افسانے شامل ہیں۔یہ سبھی افسانے نئے ہیں اور سنجیدہ قرات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ان کے کئی افسانوں میں دم نظر آتا ہے مثلاً صیاد کا معاہدہ ،نروان ،بھوک ،شطرنج کی بازی،تم بن، زرد پتے کا شمار ہوتا ہے۔ان کے افسانوں کے تعلق سے کتاب کے فلیپ پر معروف فکشن نگار شموئل احمد لکھتے ہیں۔:

'' ان کے افسانے گہرے سیاسی اور سماجی شعور کا پتہ دیتے ہیں۔رمانہ نے سیاسی و سماجی بد عنوانیوں کے خلاف ہمیشہ احتجاج کیا ہے۔ان کی سوچ اور بے باک لہجہ انہیں اپنے ہم عصروں سے الگ کرتا ہے۔''

[شموئل احمد،شطرنج کی بازی،رمانہ تبسم]

''بے سمت قافلے'' کشمیر کے نوجوان افسانہ نگار طارق شبنم کا دوسراافسانوی مجموعہ ہے۔اس سے قبل ان کا ایک مجموعہ ''گمشدہ دولت'' شائع ہوکر مقبول ہو چکا ہے۔ان کی ایک اور کتاب ''منتخب افسانے'' ۲۰۲۱ میں شائع ہوچکی ہے۔طارق شبنم فیس بک پر ایک ادبی فورم، وولر ادبی فورم، کے صدر بھی ہیں ،جس کے تحت ہر سال افسانوں کا ایک ایونٹ بھی ہوتا ہے۔

آپ کے دوسرے مجموعے'' بے سمت قافلے'' میں تقریباً ۴۴ افسانے شامل ہیں،جن میں سے بعض افسانے تو بہت ہی اچھے ہیں خاص کر ہم اڑن طشتری، حی علی الفلاح، نیا شہر، بے اعتنائی، سونے کا پیالہ ،شکور بھنگی ،زخمی دلہن ،ڈینجر زون ،کالی ناگن،علی بابا،سرخ بادل ، بے سمت قافلے کو ان کے اچھے افسانے کہہ سکتے ہیں۔ان کے افسانوں میں سماج کی اعلیٰ اقدار کا تحفظ، امن و امان ، مذہبی شناخت

، بے روزگار تعلیم یافتہ نوجوان کا کرب، خوف وڈر کا شدید احساس، ملک کا ماحول، انسان کا دہرا کردار وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ طارق شبنم کے افسانے چونکاتے ہیں۔ وہ سماج کے مختلف موضوعات پر قلم اٹھاتے رہتے ہیں۔

''جو جہاں ہے وہیں رہے'' ندیم راعی کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ ان کے افسانے عصری تقاضوں کو نہ صرف پورا کرتے ہیں بلکہ ان پر کھرے بھی اترتے ہیں۔ وہ اپنے آسپاس سے کہانی کا مواد اٹھاتے ہیں۔ اس بات کا اعتراف انہوں نے خود بھی 'اپنی بات' میں کیا ہے۔ اس سے قبل وہ دو افسانوی مجموعے 'ایسی بھی اک عید' اور 'حرف حرف تیرے نام' دے چکے ہیں۔ اس تازہ مجموعے میں ان کے ۲۴ افسانے شامل ہیں۔ ان کے کئی افسانے کافی ہاؤس، آخری بوسہ، جو جہاں ہے وہیں رہے، پھر تاریخ مل گئی، اندھری رات، موڈرن دیوداس، تصویر کا رخ، سپنوں کا تاج محل اچھے افسانے ہیں۔

'جو جہاں ہے وہیں رہے' مجموعے کا ٹائٹل افسانہ ہے۔ یہ افسانہ کووڈ ۱۹ کی دلخراش داستان ہے۔ ممبئ سے اڈیسہ کا تقریباً ۱۶۰۰ کلومیٹر لمبا سفر، کوئی پیدل، کوئی سائیکل پر، ٹوٹی پھوٹی بیل گاڑیوں اور بھینسا گاڑی سے رواں دواں تھے۔ ہر طرف لوگ مر رہے تھے، سفر میں لوگ مررہے تھے، بوڑھے والدین، چھوٹے بچے، عورتیں پیدل چلنے کے باعث بیمار ہو رہے تھے، مر رہے تھے۔ وملا، اپنی حاملہ ماں کو سائیکل پر لیکر چل رہی ہے۔ بہت ہی اطھا افسانہ ہے جو ہمیں جذباتی بنا دیتا ہے۔

''شناخت'' احمد ریاض کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ ان کے افسانے سماج میں پھیلی بے چینی اور اضطراب کا مظہر ہیں۔ موجودہ زندگی اور انسان کی مکاری وعیاری، مذہب کا غلط استعمال، اذادی کا ناجائز فائدہ، عصری تقاضے، کردار کا کھوکھلا پن، رشتوں کی بے حرمتی، قدروں کا زوال وغیرہ احمد ریاض کے موضوعات ہیں۔

اس مجموعے میں احمد ریاض کے ۲۱ افسانے شامل ہیں۔ ان کے افسانے ہمیں غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ معاشرے میں مثبت اقدار کی پختگی کے خواہاں احمد ریاض، اپنے افسانوں کا ایک واضح مقصد رکھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہماری شناخت جو خالص نہ ہو کر مختلف خانوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے، وہ پھر سے واپد آئے اور ہمارے اخلاق وکردار ہماری شناخت کا حوالہ بنیں۔ افسانہ 'شناخت' میں بھی اسی بات کا غم ہے کہ ہم اپنے اخلاق وکردار اور سلوک کو نہ دیکھ کر دوسروں پر انگلیاں اٹھا رہے ہیں۔ ہم اپنی شناخت بھولتے جا رہے ہیں۔

''اجالے کی طرف'' نذیر فتح پوری کا افسانوی مجموعہ ہے۔ یہ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ یوں تو

نذیر فتح پوری ۱۹۷۰ سے ہی افسانے لکھ رہے ہیں ۔مگر انہوں نے مجموعے کے بارے میں نہیں سوچا۔ویسے وہ ایک منجھے ہوئے فنکار ہیں۔وہ شاعر، ناقد،محقق،صحافی،سفر نامہ نگار،افسانچہ نگار، ناول نگار ہیں۔ان کی متعدد کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔

'اجالے کی طرف' میں ان کے ۲۴ افسانے شامل ہیں ۔یہ سبھی افسانے ۷۰ سے اب تک مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں۔ان میں ان کا اسلوب سیدھا سادہ ہے۔ان میں کوئی بڑا فلسفہ ہے نہ ہی کسی ٹرینڈ کے شروع ہونے کے اشارے۔یہ سب عام انسانوں کی کہانیاں ہیں۔جو آپ کو باندھے رکھتی ہیں۔ان میں جذبات ہیں، گہرائی ہے،کردار ہیں،قصہ پن ہے،ایک امید ہے جو زندگی بخشتی ہے ۔کئی افسانے ،اچھے افسانوں کے زمرے میں رکھے جاسکتے ہیں۔روشنی کی تلاش،کبوتروں والی حویلی ،سرحد پار سے جواب،اجالے کی طرف ،آخری بونڈ کا سفر،فاصلوں کا کرب وغیرہ ایسے افسانے ہیں جو نذیر فتح پوری کو افسانوی دنیا میں زندہ رکھیں گے۔

''زندگی میں پہلی بار'' جمشید پور کے نیاز احمد آسی کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔نیاز بہت زمانے سے اس دشت کی سیاحی کر رہے ہیں۔ان کا مجموعہ بہت تاخیر سے آیا۔ان کے اس مجموعے میں چھوٹی بڑی تقریباً ۳۲ کہانیاں شامل ہیں۔یہ سبھی کہانیاں سماج اور معاشرے کی کہانیاں ہیں۔ان کا انداز پرانا ہوسکتا ہے مگر ان میں الگ قسم کا تاثر ہے۔نیاز احمد آسی کے افسانے ان کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ان میں مصنف نے اپنا خونِ جگر جلایا ہے۔بعض کہانیاں آپ کو آپ بیتی لگیں گی مگر یہ دراصل جگ بیتی ہیں۔کتاب میں ان کا ایک مضمون ''میں اور میری کہانیاں'' شامل ہے جس کے مطالعے سے مصنف کے نظریے سے واقفیت ہوتی ہے۔ان میں بعض افسانے ضرور ان کی شناخت بنیں گے۔ان کے اچھے افسانوں میں وہ، پاگل، دمِ واپسیں،طوفان آنے والا ہے،زندگی میں پہلی بار، ماں،آخری سوال ،گھر واپسی، جاگتے رہو،نوٹ کا شمار ضرور ہونا چاہیے۔ان میں عصری زہرناکی ہے تو بیان کی پرکاری بھی۔افسانے کا ایک اقتباس دیکھیں۔:

''وہ میرے سوالات کا جواب دیے بغیر میرا ہاتھ پکڑتا ہوا، مجھے گھسیٹ کر دوسری طرف لے گیا۔''یہ میرٹھ کی فیروز بلڈنگ ہے، جہاں مظلوم انسانوں کو کمروں میں بند کر کے آگ لگا دی گئی تھی۔جہاں سارے لوگ جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گئے تھے۔''

[افسانہ: وہ،زندگی میں پہلی بار، نیاز احمد آسی،ص۔۱۵]

گذشتہ سال افسانچوں کے کئی مجموعے بھی سامنے آئے۔سیکھنے میں یہ آرہا ہے کہ اب افسانچے خاصی

تعداد میں شائع ہو رہے ہیں ۔ بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ آج کل افسانچوں کا زمانہ ہے ۔ خاص کر مہاراشٹر میں افسانچے خوب لکھے جا رہے ہیں۔ اقبال نیازی کے افسانچوں کا مجموعہ ''چیونٹیوں کے درمیاں'' اسی سال منظر عام پہ آیا ہے۔ اس میں ۱۰۲ افسانچے شامل ہیں۔ جن میں عصری معاملات و واقعات اور مسائل کو بخوبی افسانچے کا پیرہن عطا کیا گیا ہے۔ اقبال نیازی کے افسانچوں کا ایک وصف انہیں اپنے ہم عصر افسانچہ نگاروں سے امتیاز بخشتا ہے۔ ان کے کئی افسانچوں میں ڈرامائی عناصر کی بہتات نظر آتی ہے، دراصل اقبال نیازی ایک اچھے ڈراما نگار اور کامیاب ہدایت کار بھی ہیں۔ ان کے ڈراموں کے کئی مجموعے اور بچوں کے لئے ڈرامے بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔ لہٰذا ان کے افسانچوں میں ڈرامائی رنگ کا آجانا عین فطری ہے۔ دوسرے انہوں نے کئی اشعار پر بھی افسانچے لکھے ہیں۔ ان کے اچھے افسانچوں میں ہم 'وہ بھی ضروری تھا'، چیونٹیوں کے درمیاں، وہ مسبب الاسباب ہے، سچ اور جھوٹ کی دکان، مہمان، سسکیاں اور صبر، کون ہوں میں، غم غلط، نیم پلیٹ، جملے باز، گھسی ہوئی سینڈل، ایش ٹرے اور سلگتی سگریٹ، شیلف میں رکھے بہانے، آن لائن نفرت ڈیلیوری، زنگ آلود قفل، دروازہ، گھر گھر ترنگا، کا شمار کرسکتے ہیں۔ اقبال نیازی ایک افسانچہ آپ بھی دیکھیں۔

ملبہ میں دفن ہیں

''چار منزلہ عمارت دھڑ دھڑاتے ہوئے بیٹھ گئی۔۔
جیسے تاش کے پتے بکھرتے ہیں۔۔ ہر طرف چیخ پکار۔۔ گرد و غبار۔۔
ملبہ سے انسانوں کو زخمی حالت میں باہر نکال لیا گیا لیکن۔۔
خواب، امیدیں، اسائشیں، خواہشیں، ابھی بھی ملبے کے نیچے دفن ہیں۔''

پروفیسر فیروز خان فیروز کے افسانچوں کا مجموعہ ''تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟'' ابھی ابھی شائع ہوا ہے۔ فیروز خان کا افسانچہ لکھنے کا انداز مختلف ہے۔ وہ معاشرے کے نشیب و فراز پر گہری نظریں رکھتے ہیں، جس کا اظہار وہ طنزیہ طور پر اپنے افسانچوں میں کرتے ہیں۔ ان کے افسانچے سری حالات کی عمدہ عکاسی کرتے ہیں۔ اس مجموعے میں ان کے افسانچے اور منی کہانیاں شامل ہیں۔ یہ مجموعہ اپنے اندر ۱۱۶ افسانچے اور منی کہانیاں لئے ہوئے ہے۔ ان میں کئی بہت اچھے افسانچے ہیں۔ ان کے مشہور افسانچوں میں جھوٹ سچ، نہلے پہ دہلا، آخری لمحہ، گمشدہ بیٹا، اذان سے نماز تک، ایڈوانس موت، وصیت نامہ، ادب کا چور، پانچواں دھماکہ، ہوس کی جستجو، آج کا دجال، بیڈ روم کی آنکھیں، ٹوٹتا سلسلہ، خراٹے کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ فیروز خان فیروز کا ایک افسانچہ دیکھیں۔

''اچھا۔۔آپ سب گورنمنٹ کنٹیر کٹر ہیں۔۔''

''ہاں صاحب۔۔!''سبھی نے یک زبان ہوکر کہا۔

''وہ انجینئر۔۔بغیر رشوت لئے،بل پر دستخط نہیں کرتا ہے۔۔۔!''

''ہاں صاحب۔۔!''

''پھر آپ۔۔مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔۔؟''

''اس کا تبادلہ۔۔!!''

''ٹھیک ہے۔کام ہوجائے گا۔۔یہ بینک اکاؤنٹ نمبر ہے۔۔اس میں پانچ لاکھ روپے جمع کرادیجیے۔۔''

افسانچہ ختم ہوجاتا ہے۔اس میں سب کچھ کھل جاتا ہے۔اگر افسانچہ بینک اکائنٹ نمبر ہے، پر ہی ختم ہو جاتا تو اس کا تاثر اور بڑھ جاتا۔

'' آدمی مسافر ہے''ڈاکٹر فیض قاضی آبادی کا تازہ مجموعہ ہے۔جس میں ۹۰ افسانچے شامل ہیں۔یہ افسانچے چلتی پھرتی کہانیاں ہیں جو اپنے دامن میں عصری معاملات وحادثات کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ان میں طنز ہے تو معاشرے کے قصے ہیں۔ان میں کشمیر کے لوگوں کا درد ہے تو مذہبی آنچ بھی ہے۔ماحول کی گرمی ہے تو سرد جذبات بھی ہیں۔ان میں دو تین سطروں لے کر دو دو صفحے کے افسانچے بھی ہیں۔فیض قاضی آبادی کے اچھے افسانوں میں امید کا خون،وقت ہی نہیں ملتا،راشن ڈپو،درندوں کی بستی ،کرارے نوٹ،دوسری شادی ،ہوس کی انتہا،میں اشرف مخلوق نہیں،احترام صیام ،چپ کی داد،مسجد کا ظاہر،مشاعرہ ،خشک سالی ،گڈا ،پوٹلی ،اغوا کا ضرور شمار ہونا چاہیے ۔ایک افسانچہ ملاحظہ فرمائیں۔

چپ کی داد

''مسجد فرقان سے دو ساتھیوں نے کرامت علی کے گھر پہنچ کر ان سے ملاقات کی۔کرامت علی نے ان کی بات سننے سے پہلے ہی انہیں کھری کھری سنائی۔تقریباً آدھ گھنٹے تک دونوں ساتھی کرامت صاحب کی باتیں چپ چاپ سنتے رہے۔انہوں نے جب اپنی بات ختم کی تو ان میں سے ایک نے جیب سے ڈائری اور قلم نکال کر ادب بجالاتے ہوئے کہا۔

''حضور!۔۔یہ جو آپ نے اچھی اچھی باتیں کیں۔یہی باتد وسروں کو سکھانے آپ کب سے ہمارے ساتھ جماعت میں نکلیں گے۔''

’’تماشا‘‘ محمد علیم اسماعیل کے افسانچوں کا مجموعہ ہے۔محمد علیم اسماعیل ۱۰۔۱۲ برسوں سے شائع ہونے کے معاملے میں نوجوان فکشن نگاروں اور ناقدین کی صف اول میں ہیں۔ان کے افسانے اور افسانچے ملک و بیرونِ ملک کے رسایل کی زینت بنتے رہے ہیں۔ان کی تحریروں میں عصری مسائل کے ساتھ طنز کے نشتر بھی ملتے ہیں۔موجودہ سماج کے دوہرے کردار کے مالک افراد، رشتوں کی پامالی ،فرقہ پرستی کا زہر، سیاسی چپقلشیں اور خواتین پر ہونے والے ظلم وستم کو علیم اسماعیل خاص کر اپنے افسانچوں میں ڈھالتے ہیں۔ان کے افسانچے معاشرے کے عکاس ہیں۔

اس مجموعے میں ان کے ۷۰ افسانچے شامل ہیں۔یہ سبھی الگ الگ ہیں۔ان کے موضوعات ،اسلوب، کرداراوران کا Treatment الگ ہے۔اسی لئے ان میں یکسانیت نہیں ملتی بلکہ ان کے پڑھنے میں الگ لطف آتا ہے۔ایک افسانچہ آپ بھی دیکھیں:

بہواور بیٹی

’’یہ بھارت ہے! بھارتیوں کا ملک !ایک اٹالین عورت، سونیا گاندھی اس دیش کی وزیراعظم کیسے بن سکتی ہے؟ کچھ بھی ہوجائے یہ ہم نہیں ہونے دیں گے۔‘‘

پھر کچھ برسوں بعد وہی شخص خوشی خوشی کہہ رہا تھا:’’سنا تم نے!!! ہمارے ملک بھارت کی بیٹی، کملا ہیرس امریکہ کی نائب صدر بن گئی ہیں۔آج میرا سینہ فخر سے پھول گیا ہے۔‘‘

ان کے کئی افسانچے تو ہمیں سر دھننے پر مجبور کردیتے ہیں۔ساتھ ہی ہمیں غور فکر کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ایسے افسانچوں میں بہواور بیٹی ،شہرخموشاں، حل، اور منٹو شرما گئے، دہشت گرد، ایک بچی کی خود کلامی، کامیابی کا راز، دیا اور تھالی، باغ اور مالی، قاتل کون؟ وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

☆☆☆

ادب اطفال:’’عریش‘‘ قمر جمالی کی بچوں کے لئے تخلیق ہے۔جسے قومی کونسل برائے اردو زبان نے شائع کیا ہے۔قمر جمالی ایک کہنہ مشق فکشن نگار ہیں۔ان کی کئی کتابیں، افسانوی مجموعے، ناول اور دیگر تخلیقات شائع ہوچکی ہیں۔

اس کتاب کو مصنفہ نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔حصہ اول میں ٦ سے ١٢ سال تک کے بچوں کے لئے کہانیاں ہیں۔اس میں ان کی لکھی ہوئی چھ کہانیاں شامل ہیں۔ جو ایک سے ایک ہیں۔حصہ دوم جو ١٢ سے ہائی اسکول تک کے بچوں کے لئے ہے، میں سات کہانیاں شامل ہیں۔کتاب کے آخر میں دو ڈرامے بھی شامل کئے گئے ہیں۔اس کتاب کی اچھی بات یہ ہے کے بڑے بچوں کی کہانیوں کے بعد مشکل الفاظ کے معنی بھی درج کئے ہیں۔ان کہانیوں اور ڈراموں سے بچوں کے اخلاق وکردار میں بہتری پیدا ہوگی۔ان میں اعتماد پیدا ہوگا اور اپنے دین کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

''آسمانی گڑیا'' معصومہ الغروی کی تخلیق ہے۔معصومہ کی یہ پہلے کاوش ہے۔یہ ناول بچوں کے لئے ہے۔اس ناول میں معصومہ نے کھیل کھیل میں حضور کی احادیث اور حضرت علی (رض) کے اقوال اس طرح پروئے ہیں کہ کہیں سے لگتا نہیں کہ یہ تمام ناول میں زبردستی لایا گیا ہے۔نہ ہی ان سے ناول کی کہانی میں کوئی جھول پیدا ہوتا ہے۔اس ناول کے اہم کرداروں میں اقرا،اس کے والدین،سعدیہ اور نور نام کی ایک لڑکی ہے۔نور بات بات میں اقرا کو قرآن محدیث اور حضرت علی کے اقوال سکھاتی ہے۔یہ ناول بچوں کے اندر اچھے اخلاق اور دینی معلومات کے لئے اشد ضروری ہے۔

فکشن تنقید: ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کی نئی کتاب ''اردو فکشن: تنقیدات وتفہیمات'' شائع ہو گئی ہے۔ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی بہار کی راجدھانی پٹنہ یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے ایک معروف فکشن ناقد ہیں۔بہار اور جھارکھنڈ میں فکشن کی تنقید لکھنے والوں میں ایک معتبر نام شہاب ظفر اعظمی کا ہے۔اس کتاب پر بحیثیت مرتب ڈاکٹر محمد حسین کا نام ہے۔اس سے قبل شہاب ظفر اعظمی کئی کتابیں اردو ناول کے اسالیب، جہانِ فکشن، مطالعاتِ فکشن، متن اور معنی، قرات: مطالعہ ومحاسبہ منظر عام پر آچکی ہیں۔ان کی گرفت فکشن کے ہر پہلو پر سخت ہوتی ہے، وہ فکشن کی باریکیوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔مذکورہ کتاب میں ان کے ذریعہ لکھے گئے سترہ مضامین شامل ہیں، جن میں انہوں نے امدادامام، پریم چند، اختر ارینوی سے لے کر عبدالصمد، انیس رفیع، غضنفر، بیگ احساس کی افسانہ اور ناول نگاری پر بات کی ہے تو نئی نسل کے فکشن نگار پرویز شہریار، مشتاق احمد وانی اور اوینا ش امن کے فن پہ بھی بات کی ہے۔اس کتاب میں کئی مضامین موضوعاتی بھی ہیں۔پوری کتاب فکشن تنقید کے پڑھنے والوں کے لئے بہت مفید ہے۔معروف فکشن نگار عبدالصمد شہاب ظفر اعظمی کے تعلق سے لکھتے ہیں۔:

’’پچھلے دس بارہ برسوں میں اردو تنقید کے میدان میں جن چند لوگوں نے تیزی کے ساتھ اپنی پہچان بنائی ہے، ان میں شہاب ظفر اعظمی کا نام نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ خوش قسمتی سے ان میں زیادہ تر نو جوان ہیں اور ان سے اردو تنقید کو بڑی توقعات وابستہ ہیں۔‘‘

[اردو فکشن : تنقیدات و تفہیمات، شہاب ظفر اعظمی، ص۔ ۷، مرکزی پبلیکیشنز، دہلی، ۲۰۲۴]

’’پیغام آفاقی کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ‘‘ نامی کتاب کے خالق ڈاکٹر محمد شارب ہیں۔ یہ ان کا تحقیقی مقالہ ہے۔ جسے انہوں نو ابواب میں منقسم کیا ہے۔ جن میں انہوں نے پیغام آفاقی کی سانح اور ان کے لکھے ہر ناول مکان، پلیتہ، دوست، راگنی پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے پیغام آفاقی کے معروف کرداروں اور ان کے اسلوب پر خاصی گفتگو کی ہے۔ انہوں نے پیغام آفاقی کے معاصرین شموئل احمد، شفق، علی امام نقوی، حسین الحق، نور الحسنین، مظہر الزماں خاں، عبد الصمد، غضنفر، سید محمد اشرف، صادقہ نواب سحر، ترنم ریاض، مشرف عالم ذوقی، خالد جاوید کا ذکر کرتے ہوئے موجودہ فکشن میں پیغام آفاقی کے مقام و مرتبہ کی تعین کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر شارب نے اپنی اس کتاب میں ۱۹۸۰ کے بعد اردو ناول کی صورتِ حال پر بھی خوب لکھا ہے۔ دراصل ڈاکٹر شارب نے ہر طرح سے پیغام آفاقی کے فکر و فن کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں بڑی عمدگی سے پیغام آفاقی کے ناولوں پر بات کی ہے۔ ان کے متعلق نئی نسل کے ممتاز ناقد پروفیسر ہمایوں اشرف رقم طراز ہیں۔

’’پیغام آفاقی کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ‘‘ ڈاکٹر محمد شارب کے گہرے مطالعے و مشاہدے کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے بڑی عرق ریزی، دقیقہ سنجی اور ہنر مندی سے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ کتاب پیغام آفاقی کے فکر و تخیل کا بھرپور جائزہ پیش کرتی ہے اور ان کے تخلیقی اعمال و افعال کے زاویہ کو مرکزِ نگاہ بناتی ہے۔‘‘

[پیغام آفاقی کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر محمد شارب، ص۔ ۷ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۔۲۴]

''جہانِ کہکشاں'' نامی کتاب ڈاکٹر مکمل حسین کی ہے۔اس کتاب میں کہکشاں پروین کے تمام افسانے مع مجموعوں کے شائع کئے ہیں۔کہکشاں پروین جھارکھنڈ کی معروف افسانہ نگار ہیں۔ان کا اسی سال انتقال ہوگیا تھا۔ڈاکٹر کہکشاں پروین کے افسانے علاقائی مسائل،آدی واسی زندگی اور وہاں رہنے والوں کی سماجی اور معاشی حالت کو عمدگی سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔عورتوں کے مسائل کو بڑی خوبصورتی اور ہنرمندی سے افسانوں میں ڈھالا ہے۔

ڈاکٹر مکمل حسین نے کہکشاں پروین کے تمام افسانوں کو مرتب کر کے جھارکھنڈ کے افسانوں اور کہکشاں پروین پر کام کرنے والوں کے لئے یہ کتاب نہایت اہم ہے۔اس کتاب میں ڈاکٹر کہکشاں پروین کے ایک مٹھی دھوپ ،دھوپ کا سفر ،سرخ لکیریں، پانی کا چاند ،مور کے پاؤں افسانوی مجموعوں کے سبھی افسانوں کے علاوہ دیگر افسانوں کو بھی مکمل حسین نے جمع کیا ہے۔کل ۸۴ افسانے اس کتاب میں شامل ہیں۔

''اردو ناولٹ کا تحقیقی وتنقیدی تجزیہ'' ڈاکٹر سید وضاحت حسین رضوی کا مقالہ ہے۔جو دوبارہ اس سال اضافے اور ترمیم کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔یہ اپنے موضوع پر نہایت اہم کتابط ہے۔یوں بھی اس موضوع پر بہت کم کتابیں موجود ہیں۔اس موضوع پر اردو میں یہ ایک تحقیقی وتنقیدی پر پہلی کتاب ہے ۔اس میں ڈاکٹر وضاحت حسین نے اردو ناول اور ناولٹ کے امتیازات اور ناولٹ کے اجزائے ترکیبی کو پیش کیا ہے۔یہ ان کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر انہیں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی ہے۔

ڈاکٹر وضاحت حسین نے اس کتاب کو چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ ۵۶۲ صفحات کی اس کتاب میں ناولٹ کے فن پر تفصیلی گفتگو موجود ہے۔ہر باب کے ساتھ خالق نے انصاف کیا ہے۔بڑی ہی تحقیقی جاں فشانی اور عرق ریزی سے کام لیتے ہوئے ڈاکٹر وضاحت نے ناولٹ کی ابتدا،اس کے فن اور روایت میں بتدریج اضافہ، ناولٹ کی موجودہ صورتِ حال اور مستقبل کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔انہوں نے یوسف سرمست کی رائے کی حمایت کرتے ہوئے ڈپٹی نذیر احمد کے سر ناولٹ شروع کرنے کا سہرا باندھتے ہیں اور ان کے ناولٹ 'ایامیٰ' کو اردو کا پہلا ناولٹ قرار دیتے ہیں۔وہ اچ بات پے بھی اصرار کرتے ہیں کہ ناولٹ ناول سے بالکل الگ ہوتا ہے گو کہ ناولٹ کی جسامت ناول کے مقابلے کم ہوتی ہے۔اس میں کردار بھی کم ہوتے ہیں۔کردار نگاری کی گنجائش ناول کے مقابلے کم ہوتی ہے۔اس کا پلاٹ کساؤ دار ،محدود کینوس کے ساتھ زندگی کے کسی ایک یا دو گوشوں کو پیش کرتا ہے۔منظر نگاری یا مکالموں کی بہتات ناولٹ پر گراں گذرتی ہے۔

’’منٹو پونا میں‘‘ نذیر فتح پوری کی کتاب ہے جو اسباق پبلیکیشنز، پونہ سے شائع ہوئی ہے۔منٹو کی شخصیت اور ان کے افسانوں پر خاصا کام ہوا ہے۔ادھر منٹو کے افسانچوں کو خاصی اہمیت دی جا رہی ہے۔ان کے بعض افسانچے، آج کی افسانچہ نگاروں کی نسل کے لئے مشعلِ راہ بن رہے ہیں۔اس میں بھی کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ پریم چند کے بعد اردو افسانے میں کوئی منٹو کا ہمسر نہیں ہے۔مجھے یہ بھی کہنے دیجیے کہ منٹو نے پریم چند کے بعد افسانے کو جو مقام عطا کیا، جس طرح سے افسانے میں کردار نگاری، کرداروں کی تحلیلِ نفسی اور افسانے کے اختتام پر چونکانے کا عمل دیا اس سے اردو افسانے، نے عالمی شناخت قائم کی۔

نذیر فتح پوری معروف ناقد، فکشن نگار شاعر اور صحافی ہیں۔ان کی متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔انہوں نے پونہ کے حوالے کا تحقیقی کام کیا ہے۔یہ بھی ان کا ایک کارنامہ ہے۔منٹو کے حوالے سے جو یادگار باتیں تھیں، ان سب کا احاطہ اس میں کیا گیا ہے۔منٹو کے کئی افسانوں میں پونہ کا ذکر موجود ہے۔منٹو پونہ آئے بھی ہیں۔منٹو کی بیٹیاں بھی پونہ آتی رہیں ہیں۔نذیر صاحب کی بھی منٹو سے ملاقات رہی ہے۔ان سب کا تفصیلی ذکر اس کتاب میں ملے گا۔

’’دھنورا: ایک تجزیاتی مطالعہ‘‘ ڈاکٹر ارشاد سیانوی کی کتاب ہے۔یہ کتاب اصل میں ناول دھنورا پر مختلف ناقدین اور دانشوروں کے مقالات و مضامین کا مجموعہ ہے۔کتاب کو ارشاد سیانوی نے بالکل الگ ڈھنگ سے ترتیب دیا ہے۔انہوں نے ایک طویل مقدمہ لکھا۔ایک تعارف نامہ، ناول کے اہم مکالمے اور خوبصورت منظر ناموں کو کتاب میں شامل کیا ہے۔اس کتاب میں عارف نقوی، پروفیسر سید احمد شمیم، پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر علی احمد فاطمی، نور الحسنین، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، تنویر اختر رومانی وغیرہ تقریباً ڈیڑھ درجن مضامین شامل ہیں۔

’’فکشن زاویے‘‘ محترم عشرت ظہیر کی تحریر کردہ کتاب ہے۔یہ دراصل ان کے ناول، ناولٹ، افسانہ اور افسانچے پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے۔ان سے فکشن کے بارے میں ان کے نظریے کا پتہ چلتا ہے۔انہوں نے بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے یہ مضامین قلم بند کئے ہیں۔

ناول کے ضمن میں دس مضامین ،انار کلی (مرزا حامد بیگ) روحزن (رحمٰن عباس) پری ناز اور پرندے (انیس اشفاق)اماوس میں خواب (حسین الحق) نئے دھان کا رنگ (علی امام) شہر ذات (شاہد اختر) ہجور آما (شبیر احمد) تخم خوں (صغیر رحمانی) شب ہجراں (سرور غزالی) وغیرہ پر خوب بحث کی ہے ۔ناولٹ کے خانے میں سر پٹ گھوڑا (شوکت حیات) اور افسانے میں عبد المتین ،سید محمد اشرف ،منظر کاظمی ، شفیع جاوید ،علی امام ،حسین الحق ، شفق ،مشرف عالم ذوقی ،اسلم سلازار ،شاہد جمیل تنویر اختر رومانی پر قلم اٹھایا ہے ۔افسانچے میں انہوں نے تنویر اختر رومانی اور سرور غزالی پر بات کی ہے ۔ یہ مضامین خاصے اہم ہیں اور طلبہ کے علاوہ اسکالز کے لئے بھی مفید ہیں ۔

''سلطانہ کا خواب : تعارف و تانیثی تجزیہ'' نامی کتاب پروفیسر آمنہ تحسین کی مرتب کردہ ہے ۔کہانی 'سلطانہ کا خواب' کا انگریزی سے ترجمہ ڈاکٹر صہبا جمال شاذلی نے کیا ہے ۔دراصل یہ کہانی رقیہ سخاوت حسین کی ہے جو ۱۹۰۵ میں انگریزی میں 'انڈین لیڈیز میگزین' میں شائع ہوئی تھی ۔اسے تلاش کرنے ،ترجمہ کرانے اور اس پر ایک مبسوط مقدمہ لکھا ۔مصنفہ کا تعارف تحریر کیا ۔مقدمہ بھی ایسا جس میں اس تحریر کے تانیثی پہلوؤں کو سامنے لانے کا کام کیا ۔اسے ہم پروفیسر آمنہ تحسین کی تحقیق کہہ سکتے ہیں ۔ یہ کہانی ،اردو افسانے کو ایک نئی وسعت دیتی ہے ۔انگریزی کے معیار اور ادبی رفتار سے واقف کراتی ہے ۔

''ہم صورت گر کچھ خوابوں کے ۔۔'' جاوید اختر چودھری ،(برمنگھم) کی ترتیب شدہ کتاب ہے ۔اس کتاب میں انہوں نے سلطانہ مہر کے فن اور شخصیت کو ماضی سے لے کر حال تک سمیٹا ہے ۔جاوید اختر چودھری نے اس کتاب میں سالطانہ مہر کی تحریر کردہ ڈیڑھ درجن کتابوں ہر تحریروں ،احباب کے مضامین ،انٹرویوز وغیرہ کو جمع کیا ہے ۔ہم صورت گر کچھ خوابوں کے ،میں جاوید اختر چودھری نے سلطانہ مہر کے ناول داغ دل ،تاجور ،ایک کرن اجالے کی ،جب بسنت رت آئی ،کا تعارف ،فلیپ پر لکھی آرا ،دیباچے وغیرہ کو دوبارہ جمع کیا اور کتابی شکل میں شائع کیا ۔ یہ مختلف بات ہے ۔اس کتاب میں سلطانہ مہر کے افسانوی مجموعوں بند سیپیاں ،دھوپ اور سائبان اور دل کی آبرو ریزی کا تعارف ،فلیپ پر لکھی آرا ،اور اپنے افسانوں سے متعلق سلطانہ مہر کی رائے کو جمع کر کے شائع کیا ۔

''منٹو کے کردار اور افسانے'' ڈاکٹر کہکشاں پروین کی تنقیدی کتاب ہے۔۱۷ جون ۲۴ میں ڈاکٹر کہکشاں پروین کا علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ یہ کتاب ان کے انتقال کے بعد آئی ہے۔ ویسے تو وہ جھارکنڈ کی معروف افسانہ نگار ہیں۔مگر تنقید و تحقیق بھی ان کا میدان رہا ہے۔اس کتاب میں انہوں نے منٹو کے کرداروں خاص کر نسوانی کرداروں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ساتھ ہی انہوں نے منٹو کے منتخب افسانوں کا تجزیہ پیش کیا ہے۔جن میں ہتک ،ٹھنڈا گوشت ،جول دو ،کالی شلوار،موذیل ،بؤ ،ننگی آوازیں،ممّی ،بابو گوپی ناتھ ،دھواں ،ڈرپوک ،جی آیا صاحب ،ٹوبہ ٹیک سنگھ ،کا شاندار تجزیہ کیا ہے۔منٹو کے پرستاروں اور منٹو پر کام کرنے والوں کے لئے مذکورہ کتاب بے حد اہم ہے۔

''خیال مکرر'' صائمہ صمیم کی کتاب ہے۔صائمہ خود بھی ایک اچھی افسانہ نگار ہیں۔ان کے افسانے کے دو مجموعے ''رودالی'' اور ''پچھلے پہر کی خاموشی'' منظر عام پر آ کر سند قبولیت حاصل کر چکے ہیں۔اس کتاب کی تیاری وہ کئی سال سے کر رہی تھیں۔انہوں نے پرانے افسانے پر لکھے گئے نئے افسانے کو جمع کیا ہے۔مثلاً انہوں نے انور قمر کی کہانی '' کابلی والا کی واپسی'' اور زاہدہ حنا کی کہانی ''کم کم اب آرام سے ہے'' شائع کی ہے ساتھ ہی کابلی والا (رابندر ناتھ ٹیگور) کا خلاصہ بھی شائع کیا ہے۔اس طرح انہوں نے پریم چند کا ناول گئو دان کا خلاصہ اور سریندر پرکاش کا افسانہ 'بجوکا'، کہانی 'عیدگاہ' کا خلاصہ اور عیدگاہ سے واپسی (اسلم جمشید پوری) حامد کی عید (احسان قاسمی)،کفن کا خلاصہ اور مادھو (شوکت حیات) ٹھا کر کا کنواں کا خلاصہ اور ٹھا کر کا کنواں (اقبال حسن آزاد)، رئیس خانہ کا خلاصہ اور پانچویں بوتل (صائمہ صمیم) سعادت حسن منٹو کے افسانے 'کھول دو اور' ہتک' کا خلاصہ اور کھول دو کے بعد (نجم فضلی) ہتک ایزاد (احمد جاوید) کینوس پر چھینٹے (منیر احمد فردوسی) اور عصمت چغتائی کے مشہور افسانے 'لحاف' کا خلاصہ اور لحاف والی لڑکی (مشرف عالم ذوقی) بھی شائع کی ہے۔یہ اپنے آپ میں منفرد طرح کی کتاب ہے۔

''اردو ناول میں خاندانی زندگی'' ڈاکٹر فخر الکریم کی کتاب ہے۔دراصل یہ ان کا مقالہ ہے،جس پر انہیں الہ آباد یونیورسٹی نے ڈی۔فل کی ڈگری تفویض کی تھی۔یہ مقالہ معروف ترقی پسند ناقد پروفیسر سید محمد عقیل رضوی کی نگرانی میں لکھا گیا تھا اور اپنی اہمیت کے پیش نظر دوسری بار شائع ہو رہا ہے۔یوں تو اس مقالے کو چھ ابواب میں منقسم کیا گیا ہے اور ہر باب میں موضوع سے متعلق ضمنی چیزوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔خود ڈاکٹر فخر الکریم اپنے اس مقالے میں لکھتے ہیں۔:

’یہ تونہیں کہا جاسکتا کہ اکیسویں صدی کے ربع اول کے سبھی ناولوں کوسمیٹ لیا گیا ہے لیکن یہ کوشش ضرور کی گئی ہے کہ آج کا عالمی انتشار، صارفیت میں گھرا آج کا انسان، فیشن میں دبا ہوا آج کا تہذیبی بحران، انسانیت کا فقدان دیگر سماجی اور سیاسی حالات، دہشت گردی کے واقعات کو اکیسویں صدی کے اوائل میں لکھے گئے نمائندہ اور اہم ناولوں کے حوالے سے موجودہ عہد کی زندگی کی مختلف کروٹوں کو سامنے لایا جاسکے۔‘‘

[’اردو ناول میں خاندانی زندگی‘از: ڈاکٹرفخر الکریم،ص۔۲۵۰،ہادیہ پبلیکشنز،الہ آباد]

’’تنویر اختر رومانی: فرد اور فنکار‘‘ داکٹر آفاق اختر کی مرتب کردہ کتاب ہے۔انہوں نے تنویر اختر رومانی کے فن اور شخصیت کے تعلق سے جو مضامین آئے ہیں، انہیں تلاش وبسیار کے بعد مرتبَ کیا ہے۔تنویر اختر رومانی معروف افسانہ نگار اور افسانچہ نگار ہیں۔ان کے افسانوں کا مجموعہ ’ببول‘ افسانچوں کا مجموعہ ’کھول دو‘ اور مرتب کردہ کتاب ’افسانچے کی ادبی حیثیت‘ شائع ہوکر مقبول ہوچکی ہے۔مختلف ناقدین، فکشن نگار اور دانشوروں نے ان کے مختلف پہلوؤں پر اپنی رائے مختصر اور تفصیل سے دی ہے۔یہ کتاب ایسے ہی تقریباً ۴۲ لوگوں کے مضامین اور آراء کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

’’معاصر اردو بناول میں بیانیے کا تنوع‘‘ ڈاکٹر نازیہ پروین کی تحقیقی وتنقیدی کتاب ہے۔یہ دراصل ڈاکٹر نازیہ پروین کا ڈاکٹریٹ کے لئے لکھا گیا مقالہ ہے، جو انہوں نے پروفیسر طاہرہ اقبال کی نگرانی میں لکھا ہے اس قبل بھی ان کی کتاب ’’خس وخاشاک زمانے کا تجزیہ‘‘ شائع ہوچکی ہے۔

اپنے مقالے میں انہوں نے بیانیہ پر بہت تفصیل سے کام کیا ہے۔پہلے باب’’ بیانیہ: بنیادی مباحث‘‘ میں انہوں نے بیانیہ پر خاصی بحث کی ہے۔بیانیہ کے چھوٹے چھوٹے عناصر کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔دوسرے باب’’ اردو ناول میں فطری بیانیہ کی بازیافت‘‘ تیسرے باب’’ اکیسویں صدی کے اردو ناول میں بیانیہ کے فنّی لوازم‘‘ چوتھے باب’’ اکیسویں صدی کے اردو ناول میں موضوعاتی بیانیہ‘‘ اور پانچویں باب’’ اکیسویں صدی کے اردو ناول میں مابعد جدید بیانیہ‘‘ کے تحت نازیہ پروین نے پر تحقیقی نقطۂ نظر اور تنقیدی شعور سے کام لیتے ہوئے بیانیہ کے ہر پہلو کو لیا ہے۔

''نورالحسنین کی فکشن نگاری'' ذبیح اللہ ذبیح کی تنقیدی کتاب ہے۔اس سے قبل ان کی ایک تنقیدی کتاب ''بصیرت تنقید'' سامنے آچکی ہے۔ذبیح اللہ ایک اچھے نوجوان ناقد ہیں۔وہ اپنی مرضی سے تخلیق کے نشیب وفراز پر قلم اٹھاتے ہیں۔نورالحسنین کے فکشن کے ہر پہلو پر انہوں نے اپنی تنقید کی ہے۔انہوں نے نورالحسنین کے سبھی افسانوی مجموعوں اور ناولوں پر بحث کی ہے۔نورالحسنین عصری فکشن کا ایک بڑااوراہم نام ہے۔ان کے فکشن کو ذبیح اللہ نے کئی زاویوں سے جائزہ لیا ہے۔

ذبیح اللہ ذبیح نے اپنی اس کتاب کو تین ابواب میں منقسم کیا ہے۔پہلے باب ''نورالحسنین: حیات وخدمات'' میں انہوں نے نورالحسنین کی زندگی ،تعلیم ،نوکری ،شادی ،کتابیں وغیرہ کو شامل کیا ہے۔دوسرے باب ''نورالحسنین بحیثیت افسانہ نگار'' میں ان کے تمام مجموعوں کا جائزہ لیا ہے۔تیسے باب '' نورالحسنین بحیثیت ناول نگار'' میں ذبیح اللہ نے ان کے سبھی ناولوں پر اچھا بحث ومباحثہ کیا ہے۔

''منظر کلیم :فن اور شخصیت'' ڈاکٹر اختر آزاد کی ترتیب شدہ کتاب ہے۔انہوں نے ایک اچھے ناقد کی موت کے بعد،ان پر لکھے گئے مضامین کو جمع کر کے مرتبَ کیا ہے۔اس سے قبل بھی اختر آزاد کی متعدد کتابیں ،افسانوی مجموعے ،ناول اور تنقید پع مبنی سامنے آچکی ہیں۔اس کتاب میں منظر کلیم پر ناقدین کے مضامین شام ہیں۔ساتھ ہی ان کے فکشن پر تحریر کردہ ۱۳ مضامین بھی شامل ہیں۔جن سے منظر کلیم کے تنقیدی افق کا پتہ چلتا ہے۔ان مضامین میں منظر کلیم کے وہ دو مضامیں بھی جن کے حوالے سے وہ جانے جاتے ہیں۔کالی ماٹی کا نثری ادب اور ادبِ مہجر : جڑوں کی تلاش۔منظر کلیم یا جمشد پور کے ادب پر کام کرنے والوں کے لئے یہ کتاب ناگزیر ہے۔

ترجمہ: ''سولومن کا گیت'' سرور حسین کا ترجمہ کردہ انگریزی ناول ہے جسے تزک واحتشام سے میٹر لنک نے شائع کیا ہے۔سرور حسین ایک معروف ترجمہ نگار ہیں ،انہوں نے کئی مشہور ناول اور متعدد اردو افسانوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ساتھ ہی انگریزی کے کئی مشہور ناولوں کا بھی اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ان کے تراجم کے مطالعے کے بعد یہ احساس شدید ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ ہے یا تخلیق؟ دراصل ترجمہ کرتے وقت وہ تخلیق کی روح میں اتر جاتے ہیں، پھر ایک زبان کے فن پارے کو دوسری زبان کا لبادہ کچھ اس طرح پہناتے ہیں کہ وہ اصل کے بہت قریب اور کبھی کبھی اس سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔

''سولومن کا گیت'' امریکا کے سیاہ فام ادیب ٹونی موریسن کا مشہورِ زمانہ انگریزی ناول ''Song of Solomon'' کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ ناول دراصل امریکا میں سیام فام افریقی لوگوں کے ساتھ امتیازی سلوک اور گورے کالوں کے درمیان کے سلوک کو نشان زد کرتا ہے۔ ساتھ ہی امریکا جیسی سپر پاور ملک میں نام نہاد انسانی حقوق کی پول بھی کھولتا ہے۔ ٹونی موریسن کو ۱۹۹۳ میں نوبل انعام بھی مل شکا ہے۔ وہ امریکا کے جانے جانے فکشن نگار ہیں، انھوں نے سماجی نابرابری اور رنگوں کے اعتبار سے سماج کی تقسیم کے خلاف کافی نڈر ہو کر لکھا ہے۔ سرور حسین نے اردو کی مشہور افسانہ نگار سلمیٰ صنم کے منتخب افسانوں کو انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

اس کے علاوہ تابندہ سائنائیڈ، ہکری ڈکری ڈوک، گم شدہ علامت، جہنم، داونچی کوڈ، زہراب نیل، اورینٹ ایکسپریس، اے بی سی، صد سالہ تنہائی، (یقوب یاور) مسز ڈیلوے، اشتعال کی فصل (سعید نقوی) سرحد کے پار سورج، مویان کی کہانیاں (ریحان اسلام) اگست کے آنے تک، مردہ لشکر کا سپہ سالار، خاموشی (قربان چنا) موسیٰ کا مقصد (حمزہ حسن شیخ) نمک کا جیون گھر (مَنّور آکاش) میکس ہافلار (غلام احمد بشیر اور فاروق خالد) موہن جودڑو (عزیز جیلانی) کافکا برلب ساحل (نجم الدین) کل ہو نہ ہو (عقیلہ منصور جدون) ترجمہ شدہ ناول اور منتخب کہانیاں اس سال بازار میں آئی ہیں۔ یہ کتابیں میٹرلنک پبلشرز نے شائع کی ہیں۔

ناول: ''دشتِ بے نوا'' پنجاب سے تعلق رکھنے والی رینو بہل کا سنجیدہ ناول ہے۔ اس سے قبل ان کے کئی ناول 'میرے ہونے میں کیا برائی ہے، نجات دہندہ اور متعدد افسانوی مجموعے آچکے ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں پنجاب کے مسائل کو بہتر ڈھنگ سے اٹھانے کا کام کیا ہے۔

اس ناول ''دشت بے نوا'' میں بھی انھوں پنجاب کے سلگتے ہوئے مسئلے کو اٹھایا ہے۔ جس آج پنجاب کا تقریباً ہر گھر جوجھ رہا ہے۔ یعنی نشے کی لت، آج نوجوانوں کو اندر سے کھوکھلا بنا رہی ہے۔ نئی نسل اس کا شکار ہو کر موت کے منھ میں جا رہی ہے۔ نشہ آج پنجاب کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ ناول نگار نے اپنے اس ناول کو پنجاب کی بدنصیب ماؤں کے نام کیا ہے۔

یہ ناول کولاژ تکنیک میں لکھا گیا ہے۔اس میں پنجاب کی آٹھ مشہور کہانیاں ہیں۔ان سب کو ہلکی کہانی اور نشے کے اشتراک سے جوڑا گیا ہے۔سبھی کہانوں ایک ہی تاثر ہے اور وہ ہے نشہ۔یہ نشہ کئی طرح کا ہے،شراب ،افیم ،چرس ، اسمیک ، ہیروئن ،کوکین،سنتھتک ڈرگ وغیرہ کا استعمال رقیق ،گولی اور انجکشن کی شکل میں پورے پنجاب میں ہر جگہ دستیاب ہے۔اس نشہ کی لت میں گرفتار ہوکر نجانے کتنی ماؤں کے جگر کے ٹکڑے اپنی زندگی سے ہار گئے ۔کہنے کو نشے کی ہر چیز پر پابندی ہے مگر یہ سب جگہ ملتا ہے۔پولس،حکومت اور انتظامیہ بھی اندر خانے نشے والوں کی مدد کرتی ہے۔رینو بہل نے ان حالات کو عمدگی سے ناول ''دشتِ بےنوا'' میں بیان کیا ہے۔

''ہیچ'' ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ فکشن نگار انیس اشفاق کا ناول ہے۔اس سے قبل بھی وہ کئی ناول تحریر کر چکے ہیں۔'دکھیارے ۲۰۱۴،خواسراب ۲۰۱۷ اور'پری ناز اور پرندے'۲۰۱۸ میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔وہ ایک معروف ناول نگار اور ناقد ہیں۔انہوں نے اپنی فکشن تحریروں میں لکھنوی تہذیب کے باقیات پیش کی ہے۔لکھنو کے گلی کوچے،تاریخی عمارتیں، محلے، بازار،مرغ بازی،نوابی رنگ،امام باڑے،محفلیں،مرثیہ اور سوزخوانی وغیرہ کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

مذکورہ ناول'ہیچ' میں انہوں نے لکھنو کی زندگی اور آداب کو دکھانے کی کاوش کی ہے۔آزادی کی لڑائی اور لکھنو سے کئی خاندانوں کی ہجرت اور یہاں رہنے والوں کے کرب کو بہتر ڈھنگ سے ناول کیا ہے۔آزادیء رائے کچھ لکھنو اور بہت کچھ جے این یو کے ماحول میں پوری ہوجاتی ہے۔شہنام،شہلا اور شہناز کے شانوں پر مصنف نے مسلمانوں کو بیدار کرنے اور ہندوستان کے ماحول کو درست کرنے کی اہم ذمہ داری ڈال دی ہے۔مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے ہر بڑے واقعے کو مصنف نے اپنے ناول میں اس طرح پیش کیا ہے کہ اردو والے سمجھ جائیں،کوئی اور سمجھے یا نہ سمجھے۔یہ ایک بہترین ناول ہے۔

ان کے علاوہ میٹرلنک پبلشرز نے زندگی ایک ناراض متن (شاہدہ دلاور شاہ) گلیوں کے لوگ، یہ راستہ کوئی اور ہے (اقبال حسن خان) استغاثہ، ہلکی میں مرگ،موکش،کرول گھاٹی (غافر شہزاد) شہر مد فون (خالد فتح محمد) ہاتھی چوک ،سائیں انٹرنیٹ (سرفراز بیگ) حیدر گوٹھ کا بخش،ہر ایک جنم کی جانما،وجود (حفیظ خاں) گل مینہ (زیف سید) کوفے کے مسافر (علی اکبر ناطق) موت کی حمایت میں (حفیظ تبسم) ادھوری کہانی (سید سعید نقوی) لواخ (اختر رضا سلیمی) کے ناولوں کو پھر شائع کیا ہے۔

وفیات : کچھ فکشن نگاراوراہم شخصیات ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئیں ۔جس سے بے شک ادب کا بڑا نقصان ہوا ہے ۔ان کا تحریر کردہ ادب ہمیشہ ہماری رہنمائی کرتا رہے گا۔اس دارِ فانی کو چھوڑنے والوں میں ترقی پسندی کا نمائندہ افسانہ نگار، ناولٹ نگار، افسانچہ نگار، سفر، ڈراما نگار، ہدایت کار، صحافی عارف نقوی (جرمنی) معروف افسانہ نگارنا قدڈاکٹر کہکشاں پروین (رانچی) نوجوان شاعر وفکشن ناقدڈاکٹرراشد انور راشد(علی گڑھ)معروف افسانہ نگار پروفیسرلطیف احمد (بنگلہ دیش)معروف کشمیری افسانہ نگارعبدالغنی شیخ لداخی (لداخ)مشہور ناول نگارابدال بیلا (کراچی)افسانہ نگارناقدبلراج بخشی (جموں)مقبول افسانہ نگارمحمداحمدانصاری ٗ(شاہجہاں پور) شامل ہیں۔

انعامات :اس سال اردو کے کئی فکشن نگاروں کی خدمت میں انعامات پیش کئے گئے ۔ڈاکٹرصادقہ نواب سحرکوان کے ناول ’’ راجدیو کی امرائی ‘‘ کے لئے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے دہلی میں ساہتیہ اکادمی کے ایک بڑے جلسے میں نوازا گیا۔ جاوید عنبر مصباحی کواس سال کا ساہتیہ اکادمی یوا پرسکاراور ترجمہ ایوارڈ احسن ایوبی کو حاصل ہوا۔اس سال نورالحسنین کولکھنو میں ایک باوقارتقریب میں شمیم نکہت فکشن ایوارڈ ، غالب اکیڈمی ،حضرت نظام الدین میں ڈاکٹرنگار عظیم کوراجستھان رسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے دیا جانے والا باوقار’’ قمررئیس ایوارڈ ‘‘ ، پروفیسر ہمایوں اشرف اور پرویزشہریارکوشعبہ اردو، میرٹھ یونیورسٹی ،کریم سٹی کالج اور ٹاٹا اربن سروسز کی طرف سے’’ ڈاکٹرمنظر کاظمی فکشن تنقیداور فکشن ایوارڈ ‘‘۔اورنگ آباد میں اسباق پبلیکیشنز، پونہ کی جانب سے مناظر عاشق ہرگانوی ایوارڈ معروف فکشن نگارڈاکٹرعظیم راہی کودیا گیا۔

☆☆☆

Kaifi Azmi(Monograph) : Ek Mutala by Farooq Jaesi(Kanpur)

فاروق جائسی (کانپور) cell-9839375197

کیفی اعظمی (مونوگراف): ایک مطالعہ

پروفیسر صغیر افراہیم، ایک مشہور و معروف نثر نگار ہیں۔ یہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو کے پروقار عہدے سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ان کی اہلیہ پروفیسر سیما صاحبہ بھی درس و تدریس سے وابستہ تھیں، افسوس کہ وہ حیات فانی کو الوداع کہہ چکی ہیں۔ پروفیسر صغیر افراہیم، اپنی اہلیہ کے نام سے ''سیما'' نام کا مجلہ شائع کرتے ہیں جو اپنے شعروادب اور تنقید و تبصرہ نیز موقر مضامین کے حوالہ سے ہندو پاک میں اہمیت کا حامل ہے۔

پروفیسر صغیر افراہیم کو مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کولکاتا نے نجی اشاعتی سکیم کے تحت ''کیفی اعظمی'' پر ایک مونوگراف لکھنے کے لئے منتخب کیا تھا۔ یہ ''کیفی اعظمی'' مونوگراف ۲۰۲۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔ کیفی اعظمی پر یہ مونوگراف ایک اہم ادبی دستاویز ہے جس کے لئے پروفیسر صغیر افراہیم اور مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کولکاتا کی سکریٹری محترمہ نزہت زینب صاحبہ قابلِ مبارکباد ہیں۔

''مونوگراف'' ایک مرکب گریک لفظ ہے۔''مونو'' کے معنی ایک اور ''گراف'' کے معنی، لکھنا لئے جاتے ہیں۔ مونوگراف کے لغوی معنی تھیسس، مقالہ، مضمون وغیرہ ہیں۔اس کے تحت ایک ہی موضوع پر ایک یا ایک سے زیاد لکھنے والے وہ سارا مواد یکجا کر دیتے ہیں جو کسی خاص موضوع یا کسی خاص شخص کی زندگی، افکار، خیالات اور اس کی تحریر کا احاطہ کرتا ہے۔ ایک ہی شخص یا موضوع پر بہت سی کتابوں کا مواد ایک ہی کتاب میں جمع کر دینا بھی مونوگراف کے تحت شمار کیا جاتا ہے۔

According to the information availably on internet MONOGRAPH deals with all sophiticated knowledge of a group of newly discovered species collected and sythesised available informations, ecological associations, Geographic and morphological associations.

سب سے پہلا مونوگراف، حیاتیاتی درجہ بندی (Biological Texonomy) کے

سلسلہ میں ۱۶۷۲ء میں لکھا گیا۔ یہ مونو گراف ایک پودے کے سلسلہ میں تھا جو پلانٹیرم امبلیفیر م (PLantarum umblifreum) کے نام سے جانا گیا۔ یہ درجہ بندی پودوں اور دیگر جانداروں کے مطالعہ کے لئے بہت مفید ہے۔

اب یہ لفظ ''مونوگراف'' اردو ادب میں کسی ادیب وشاعر کی پوری حیات وافکار اور اس کی تخلیقات کو یکجا کر دینے کے لئے استعمال ہونے لگا ہے خواہ وہ مصنف کے اپنے خیالات، تجربات اور تجزیات ہوں یا اس پر پہلے سے لکھی گئی کتابوں کے اہم مواد کو یکجا کر دیا گیا ہو۔ مونو گراف کی اہمیت کو نظر میں رکھتے ہوئے بہت سے مونو گراف لکھے گئے۔ مختلف اردو اکیڈمیوں اور ساہتیہ اکاڈمی وغیرہ نے مونو گراف لکھوائے تا کہ کسی مصنف، شاعر یا اہل قلم کے بارے میں پوری معلومات یکجا ہو جائیں۔

اسی اہمیت، افادیت اور مقبولیت کے پیش نظر پروفیسر صغیر افراہیم سے مغربی بنگال اردو اکادمی نے کیفی اعظمی پر مونو گراف لکھوا کر شایع کیا ہے۔ اس مستحسن کام کے لئے مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے بہت ہی مناسب شخص کا انتخاب کیا ہے۔ آیئے کیفی اعظمی کے مونو گراف پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ جان لیا جائے کہ متذکرہ مونو گراف لکھنے والا کس مرتبہ اور کس بلندیٔ افکار کا حامل ہے، بلکہ مجھے یہ کہہ لینے دیجئے کہ:

مت سہل اسے جانو پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

پروفیسر صغیر افراہیم ابن محمد یعقوب بیگ نے ۱۲ر جولائی ۱۹۵۳ء کو اناؤ (یو۔ پی) میں اپنی آنکھیں کھولیں۔ ابتدا سے بارہویں کلاس تک اپنے وطن اناؤ ہی میں تعلیم حاصل کی۔ پھر ان کا طالعِ بیدار انہیں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی لے کر آ گیا۔ یہیں صغیر افراہیم نے ۱۹۷۸ء میں بی۔ اے آنرس کیا۔ یہیں سے ۱۹۸۰ء میں ایم۔ اے (اردو) کیا۔ ان کو امتیازی نمبر حاصل کرنے کے اعتراف میں اے۔ ایم۔ یو نے گولڈ میڈل سے نوازا۔ پھر تو جیسے اللہ نے ان کی کامیابیوں کو پرِ پرواز عطا فرما دیا ہو۔ انہوں نے ۱۹۸۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۸۹ میں یہیں رسرچ اسوسیئٹ (R.A.) بن گئے۔ پھر ۱۹۹۳ء میں لکچرر کے عہدے پر فائز ہوئے اور تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے ۱۹۹۴ء میں سینئر لکچرر بن گئے۔ ۱۹۹۷ء میں اے۔ ایم۔ یو میں ریڈر کے عہدے کے لئے منتخب ہوئے، ان کی بہترین کارکردگی کو دیکھتے ہوئے انہیں ۲۰۰۵ء میں پروفیسر کا عہدہ تفویض کر دیا گیا۔ اب وہ گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ

طالبعلموں کوعلم کی روشنی سے منور کرنے میں اپنا وقت صرف کرتے رہے اور ۲۰۱۸ ء میں سبکدوش ہوئے ۔ان کی نگرانی میں پانچ ایم ۔فل اور بیس سے زاید طالب علموں کو پی ایچ ۔ڈی کی ڈگریاں تفویض کی گئیں ۔اب بھی کئی طالبعلم ان کی نگرانی میں پی ۔ایچ ۔ڈی کے حصول کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں ۔

اپنے سروس کیرئیر کے وقفہ میں انہیں بہت سے اہم کام انجام دینے کے لئے منتخب کیا گیا جس میں چیف اسکروو ٹینائزر ،کورس کوآرڈینیٹر ، پرووسٹ جیسی اہم ذمہ داریاں قابلِ ذکر ہیں ۔اس کے علاوہ وہ درجنوں اہم ذمہ داریاں ان کے سپرد رہیں جواے ۔ایم ۔یواور دیگر یونیورسٹیز سے متعلق تھیں ،جنہیں انھوں نے بصورتِ احسن نباہا اور اپنے ہم عصروں میں سرخروئی حاصل کی ۔ان اہم عہدوں میں جوائنٹ سکریٹری ،جنرل ایجوکیشن ، اے ایم یو☆ سکریٹری جنرل ایجوکیشن ، اے ایم یو☆ ایڈیٹر حسرت موہانی سوونیر، اناؤ ☆ ایڈیٹر خبر نامہ ’’رفعت‘‘ اے ۔ایم ۔یو☆ ایڈیٹر’’ دانش‘‘ آرٹ فیکلٹی جرنل ☆ پروگرام آفیسر ،این ایس ۔ایس ، اے ۔ایم ۔یو☆ ممبر آف فیکلٹی آف آرٹس کمیٹی بطور لکچرر اور بطور پروفیسر ریڈر ، اے ۔ایم ۔یو☆ ممبر آف جنرل کاؤنسل ،یوپی اردو اکاڈمی (گورنمنٹ آپ اتر پردیش) ☆ ممبر آف بورڈ آف اسٹوڈنٹس آف کشمیر یونیورسٹی ،آگرہ یونیورسٹی ،کانپور یونیورسٹی اور ساگر یونیورسٹی ☆ ممبر آف این ۔سی ۔پی ۔یوایل ، دلّی ☆ چیرمین آف بلک پرچیز کمیٹی ، این ۔سی ۔پی ۔یو ۔ایل ، نئ دلی☆ چیرمین آف گرانٹ ان ایڈ کمیٹی این ۔سی ۔پی ۔یو ۔ایل ،نئ دلی وغیرہ ۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ درس وتدریس ،ادب اور صحافت سے متعلق شاید ہی کوئی ایسا عہدہ ہوجس پر وہ متمکن نہ رہے ہوں ۔ان کے ان کارناموں کے اعتراف میں انہیں بہت سی میرٹ اسکالرشپ بھی گرانٹ کی گئیں ،جن میں اردو اکاڈمی ، جے ۔آر ۔ایف (یو ۔جی ۔سی) ،ایس ۔آر ۔ایف (یو ۔جی ۔سی) اور آر ۔اے ۔(یو ۔جی ۔سی) جیسے اہم آرگنائزیشن شامل ہیں ۔اس کے علاوہ کئی درجن ایسے انعامات سے انہیں نوازا جاچکا ہے جن کو گنوانا بہت طوالت کا باعث ہوگا ۔ان انعامات میں گولڈ میڈل برائے اول پوزیشن ان اردو (ایم ۔اے) اور شبلی اوارڈ ، نشانِ سپاس اور مجموعی خدمات انعام قابلِ ذکر ہیں ۔

پروفیسر صغیر افراہیم کو ریڈیو اور ٹی ۔وی پروگراموں میں تواتر کے ساتھ مدعو کیا جاتا رہا ہے جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے ۔ان کے یہ پروگرام ہندی اور اردو دونوں زبانوں سے متعلق ہوتے ہیں ۔انہیں اردو ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں پر ملکہ حاصل ہے ۔ان کی ٹرانسلیشن کی ہوئی کتابیں

اس بات کی گواہ ہیں ۔وہ بہت سی تنظیموں کے وائ وںڈر ممبر ہیں ،جن میں جن وادی لیکھک سنگھ،علی گڑھ، البرکات پبلک اسکول علی گڑھ، جمہوریت بچاؤ مورچہ،علی گڑھ، کاروانِ ادب (اردو رائٹر فورم) علی گڑھ، آزرادبی اکیڈمی علی گڑھ، ویزن لٹریری سوسائٹی ، اورخیابانِ ادب،علی گڑھ جیسی تنظیموں کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

پروفیسر صاحب بہت سی ملکی اور غیر ملکی تنظیموں کی مجلس مشاورت کے ممبر ہیں جن میں ''معیار'' رسرچ جنرل ،انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد(پاکستان) ☆''تحقیقی زاوئے'' رسرچ جرنل، الخیر یونیورسٹی، بھیم بر، اسلام آباد(پاکستان) ☆''دریافت'' رسرچ جرنل،نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد(پاکستان) ☆''تخلیقی ادب'' رسرچ جرنل، نیشنل یونیورسٹی آف ایم۔اے، اسلام آباد (پاکستان) اور'' تحقیقات'' رسرچ جرنل، فیڈرل یونیورسٹی آف اسلام آباد(پاکستان) شامل ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پروفیسر صغیر افراہیم کو ہندوستان ہی نہیں بیرونِ ملک میں بھی سندِ اعتبار حاصل ہے۔یہ ہمارے ملک ہندوستان کے لئے فخر کی بات ہے۔

اپنے ملک میں وہ جن مجالس مشاورت میں شامل ہیں ان میں ''تزئینِ ادب''، دھولیہ (مہاراشٹر)، ''ندائے جمہور'' لٹریری جرنل علی گڑھ اوراظہارِ خیال'' لٹریری جرنل،علی گڑھ اورخیابانِ ادب کا نام خصوصیت سے لیا جاسکتا ہے۔ان کا رہوارِ قلم یہیں نہیں ٹھہرتا بلکہ دیگر تخلیقی میدانوں کی سیر پر نکل پڑتا ہے، نتیجتاً بہت سی کتابیں منصۂ شہود پر آتی ہیں اور اپنا نشان اردو کے ادبستان میں ثبت کر جاتی ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ پروفیسر صغیر افراہیم ،علامہ اقبالؔ کا یہ شعرورد زبان رکھتے ہیں:۔

میں کہاں رکتا ہوں عرش وفرش کی آواز سے　　　مجھ کو جانا ہے بہت اونچا حدِ پرواز سے

ان کی تصنیفات میں پریم چند-ایک نقیب (اردو)، پریم چند-ایک نقیب (ہندی)، اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل، نثری داستانوں کا سفر، اردو فکشن تنقید اور تجزیہ، یگ پرورتک پریم چند ،اردو کا افسانوی ادب، اردو شاعری تنقید و تجزیہ، جگت موہن لال رواں (مونوگراف)، کڑی دھوپ کا سفر (افسانہ) ، اردو ناول تعریف تاریخ اور تجزیہ، اردو افسانہ: تعریف، تاریخ اور تجزیہ پریم چند کی تخلیقات کا معروضی مطالعہ، عصرِ حاضر میں علی گڑھ تحریک کی اہمیت و معنویت، غالبؔ، باندہ اور دیوان محمد علی جیسی اہم کتابیں شامل ہیں جن کا مطالعہ تشنگانِ ادب کے لئے نئے جہانوں اور نئے زاویوں کے دروازے وا کرتا ہے۔یہ تصنیفات ہندو پاک کے تناظر میں اپنا اہم مقام رکھتی ہیں۔

انھوں نے تالیفات کا حق ادا کرتے ہوئے سارک ممالک میں افسانہ، متن کی قرأت،

قرأۃ العین حیدر، سعادت حسن منٹو، آرٹ فیکلٹی کے ممتاز شعراء، ہمعصر اردو غزل سمت و رفتار، تفہیم اقبال میں دانشِ فرنگ کی جلوہ گری، اردو کے مختصر افسانے، حسین الحق کے منتخب افسانے، اطراف ظل الرحمن وغیرہ صفحۂ قرطاس پر سجا کر اردو ادب کے نگارخانے میں محفوظ کر دیا ہے۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے بے شمار ریسرچ پیپرس اور مضامین لکھے ہیں، جن کی تعداد اور عنوانات شاید خود ان کو نہ یاد ہو، ان کی تعداد کئی سو ہے۔ ان میں سے چند کا تذکرہ نہ کرنا کتمانِ حق کے مترادف ہوگا۔ ان کے مضامین یہ ثابت کرتے ہیں کہ پروفیسر صاحب کا مطالعہ نہ صرف بے حد وسیع ہے بلکہ ان کو بروئے کار لانا بھی ان کی دسترس میں ہے، ورنہ لوگ مطالعہ کرتے ہیں اور اسے طاق نسیاں کی خوراک بنا دیتے ہیں۔ ان کے مضامین کا حوالہ دینا ریسرچ اسکالروں کے لئے افادیت کا حامل ہوسکتا ہے اسی نظریہ کے تحت ان کے کچھ مضامین کا حوالہ دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ ان کے یہ مضامین بڑی افادیت کے حامل ہیں کہ ان کے مضامین سے آئندہ دور کے صاحبانِ قلم اپنے مطلب کا مواد حاصل کر سکیں گے۔

اس ضمن میں، فانی کے کلام میں رنگینی، غزل فن اور تنقید، کلام فانی کا تابناک پہلو، فکر وفن کی معراج ''کفن''، نثری داستانوں کا سفر، دکن میں اردو مرثیہ، ناول نے داستان کی جگہ کیوں کر لی، پریم چند کا ایک کردار ''سورداس''، مرثیہ اور اس کا ابتدائی دور، نیا زاویہ نئے رجحانات، ''کفن'' اردو افسانے کا سنگِ میل، پریم چند نقیبِ آزادی، پریم چند جنگ آزادی کی حمایت میں، اردو افسانے کا پس منظر، پریم چند کا سوانحی خاکہ، دہلی میں اردو مرثیہ، پریم چند اور مختلف تحریکیں، مرثیہ کی ابتدا اور اس کی نشونما، پریم چند کے افسانوں میں جذبۂ حریت، خواتین کے مسائل اور پریم چند، پریم چند اور ہریجن، ہماری نثری داستانیں، کہانی کی قدامت، قصیدہ، افسانے کی تعمیر اور تشکیل، مجنوں بحیثیت افسانہ نگار، کہانی انسانی وجود کی رہینِ منّت، ناول کا ابتدائی دور، سدرشن، روشنی کی رفتار ایک جائزہ، مجنوں گورکھپوری، صوفی ازم، سودا میر اور میر حسن کی مثنویاں، محب وطن پریم چند، کفن ایک تجزیہ، سدرشن کا سوانحی خاکہ، تنقید غرض و غایت، جدید افسانے کا آغاز، حجابؔ بحیثیت افسانہ نگار، پریم چند کے یہاں عورت کا تصور، محسنِ نسواں راشد الخیری، علی عباس حسینی: افسانہ نگار، نعیم احمد، نظمِ جدید کا آغاز، تنقیدی نظریہ، حکیم احمد شجاع، آزادی کی جدو جہد، پریم چند، اردو کی ابتدائی داستان وغیرہ شامل ہیں۔ میں نے صرف پچاس شایع شدہ مضامین کے نام اوپر درج کئے ہیں ورنہ میرے علم میں کم از کم تین سو ایسے مضامین اور درجنوں ریسرچ پیپرس ہیں جن کی اشاعت ہو چکی ہے، یہ مضامین بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ مندرجہ بالا مضامین کے عناوین سے پروفیسر صغیر افراہیم کی ہمہ جہت

موضوعات پر ان کی دسترس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کی فکری بالیدگی،موضوعات کی شرح بسط اور عمق بہت ہی متنوع اور افادیت کے حامل ہیں۔

پروفیسر صاحب نے ترجمہ کے میدانوں میں بھی اپنے نشانِ قدم ثبت کئے ہیں،ان کی وہ کتابیں جن کا ترجمہ انہوں نے انگریزی سے اردو میں کیا ہے ان میں،ایٹم،کائنات،ہندوستان میں سائنس کی ترقی اور مسلمان،نوبل انعام،لیزر سرجری،سائنس اور اسلام،ہندوستانی سیارچوں کی تحریک،سپر کنڈکٹر وغیرہ کا نام قابلِ ذکر ہے۔وہ کتابیں جن کا ترجمہ پروفیسر صاحب نے اردو زبان سے ہندی میں کیا ہے وہ بھی اچھی خاصی تعداد میں ہیں،ان میں :۔پریم چند ایک نقیب،ہندی اردو کہانی کل اور آج،پاکستانی کہانی ورودھ کے سور،سجاد ظہیر کی کہانیاں،سرکشی ضلع بجنور،منٹو کا ایک معترض،منٹو کی کہانیوں میں ویشیا اور سماج شامل ہیں۔انھوں نے انگریزی سے ہندی زبان میں بھی ترجمے کئے ہیں۔

پروفیسر صغیر افراہیم نے مختصر کہانیوں کے گلشن کی بھی آبیاری کی ہے۔ان کی مختصر کہانیوں میں،منزل،فاصلے کی تکمیل،شجرِ سایہ دار،سفر ہے شرط،کڑی دھوپ کا سفر،آخری پڑاؤ،جگ سونا ہے ترے بغیر،وہ خواب،ہار جیت،نیا راستہ،ننگا بادشاہ،گھر جنت،وہی فاصلہ ہے کہ جو تھا،انجان رشتے وغیرہ ہندو پاک کے مقتدر رسائل میں شایع ہوئے اور تمغۂ پسندیدگی سے نوازے گئے۔پروفیسر صاحب نے لاتعداد سیمینار اور ورکشاپ میں شرکت کی اور اپنے افکارِ عالیہ سے لوگوں کو متاثر کیا۔ان کے خطبات اور کلیدی نوٹس بھی خاصی تعداد میں شایع ہوئے اور پسندیدگی کی نظروں سے دیکھے گئے۔

یہ جان لینے کے بعد کہ'' کیفی اعظمی کا مونوگراف'' تحریر کرنے والا شخص کس مرتبہ کا مصنف،نقاد،ترجمہ نگار،افسانہ نگار،تجزیہ نگار اور خاکہ نگار رہے،ہمیں متذکرہ مونوگراف کے معیار کو متعین کرنے میں بہت آسانی ہوگی۔کیفی اعظمی پر پروفیسر صغیر افراہیم کی تحریر بہت ہی جامع ہے۔اس مونوگراف کو انھوں نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱ شخصیت وسوانح

۲ ادبی وتخلیقی سفر

۳ کیفی کی شاعری کا تنقیدی محاکمہ

۴ انتخابِ کلام

پروفیسر صغیر افراہیم نے شخصیت وسوانح کے تحت کیفی اعظمی کے سوانحی حالات،تعلیم و

تربیت، ترقی پسند تحریک سے وابستگی، شادی اور ازدواجی زندگی، شاعری کا آغاز، تخلیقات کا تعارف، انعامات و اعزازات اور رخت سفر کے تحت اپنے تحریر کردہ مونوگراف کی بنیاد رکھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کیفی اعظمی کے سلسلہ میں انھوں نے ہر اُس زاویہ کا احاطہ کیا ہے جو ایک عمدہ مونوگراف کی خاصیت ہوسکتی ہے۔ کیفی اعظمی کی سوانحی حالات کے تحت پروفیسر صاحب رقمطراز ہیں؛۔

''کیفی اعظمی ۱۴؍جنوری ۱۹۱۹ء کو گاؤں مجواں تحصیل پھولپور، اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام سید اطہر حسین رضوی ہے۔۔۔ والد سید فتح حسین رضوی اور والدہ سیدہ حفظ النساء عرف کنیز فاطمہ کے گیارہ اولادیں ہوئیں، پانچ بیٹیاں اور چھ بیٹے۔۔۔ دادا سید عطا حسین رضوی زمیندار اور ادبی ذوق کے مالک تھے لیکن ان کی رعایا انکے نظم نسق کی وجہ سے خوش نہیں رہتی تھی۔۔۔۔ والد نے ریاست بلہرہ میں تحصیلداری قبول کی، پھر راجہ محمود آباد، بعدہٗ نواب نازش علی خاں کے یہاں اعلیٰ عہدے پر فائز رہے۔'' (مونوگراف ''کیفی اعظمی'' از پروفیسر صغیر افراہیم)

پروفیسر صغیر افراہیم نے کیفی اعظمی کی تصنیف ''میں اور میری شاعری کے'' سے اقتباس سے یہ صاف کر دیا ہے کہ کیفی اعظمی کے خاندان کا ہر فرد یا تو خود صاحبِ بیاض شاعر تھا یا پھر اعلیٰ ادبی ذوق رکھتا تھا۔ متذکرہ اقتباس میں کیفی اعظمی کی مشاعرہ میں پہلی شرکت کا دلچسپ واقعہ بھی بیان کیا گیا ہے جو حضرتِ مانی جائسی کی صدارت میں ہوا تھا۔ اس مشاعرہ میں انہوں نے یہ شعر پڑھا تھا جسے مانی جائسی نے بہت پسند فرمایا تھا:

وہ سب کو سن رہے ہیں سب کو دادِ شوق دیتے ہیں کہیں ایسے میں میرا قصۂ غم بھی بیاں ہوتا

(بحوالہ ''میں اور میری شاعری'' از کیفی اعظمی)

کیفی اعظمی کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی، پھر سلطان المدارس لکھنؤ میں داخلہ دلا دیا گیا جہاں انہیں بورڈنگ میں قیام کرنا تھا مگر یہاں کی پابندیاں اور اصول ان کی آزادانہ روش کے خلاف تھیں۔ انھوں نے انتظامیہ کی مخالفت میں بورڈنگ کے بچوں کے ساتھ مل کر اسٹرائک کر دی نتیجتاً مدرسہ سے نکال دیے گئے۔ اسکے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے پرائیویٹ طور پر فارسی میں دبیر، ماہر اور کامل نیز عربی میں عالم کا امتحان پاس کیا۔ اسکے بعد الہ آباد یونیورسٹی سے فارسی میں منشی اور کامل نیز اردو میں اعلیٰ قابل کی سند حاصل کی۔ لکھنؤ میں رہ کر انہوں نے اس دور کی ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کو بہت قریب سے دیکھا۔ مگر باقاعدہ تعلیم ادھوری رہ گئی۔

پروفیسر صغیر افراہیم نے کیفی اعظمی کے سلسلہ میں بہت تفصیل سے اپنے مونوگراف میں

معلومات درج کی ہیں۔لکھنؤ میں قیام کے دوران ہی کیفی اعظمی کا کمیونسٹ پارٹی کا ممبر بن جانا، سید احتشام حسین اور علی عباس حسینی سے ملاقات، احتشام حسین کی تحریک پر ترقی پسند تحریک سے وابستگی پھر کانپور میں قیام اور مزدور طبقہ سے نزدیکی، مزدوروں اور غریبوں کی حمایت ،مولانا حسرت موہانی، ثاقب کانپوری، گنیش شنکرودیارتھی، سلطان نیازی، سنت سنگھ، منشی دیانارائن نگم اورسدرشن وغیرہ سے قربت اور کانپور کی ادبی محفلوں میں شرکت کا بیان، لکھنؤ میں ''رفاہِ عام حال'' میں ترقی پسندوں کی کل ہند کانفرنس، ''انگارے'' نامی افسانوی مجموعہ کی اشاعت، (جس میں سجاد ظہیر، احمد علی، محمود الظفر ،اور رشید جہاں کے افسانے شامل تھے،)، متذکرہ مصنفین کا تعارف، اس مجموعہ کی ضبطی کا سرکاری حکم، سجاد ظہیر کی لندن سے واپسی وغیرہ متذکرہ مونوگراف کا حصہ ہیں۔جن کے مطالعہ سے اس دور کی سماجی اور سیاسی حالات کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے اور یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ عام آدمی گھٹن، غریبی، بے کسی اور اشرافیہ طبقہ کی زیادتیوں کا شکار تھا۔اسی صورتِ حال کی تبدیلی کی خواہش نے عوام اور کیفی اعظمی کو کمیونسٹ پارٹی اور ادیبوں کو ترقی پسند تحریک کا دلدادہ بنادیا۔

ترقی پسند تحریک کی ابتدائی حالات کو بیان کرتے ہوئے پروفیسر صغیر افراہیم نے تحریر کیا ہے: ''دسمبر ۱۹۳۵ء کے اواخر میں سجاد ظہیر اپنی تعلیم سے فارغ ہوکر گھر واپس آگئے۔الہ آباد میں انھوں نے فراق گورکھپوری، اعجاز حسین، شیودان سنگھ چوہان، نریندر شرما، احتشام حسین اور وقار عظیم کی مدد سے ترقی پسند ادیبوں کا حلقہ قائم کیا۔۔۔۔پریم چند، مولوی عبدالحق، جوش ملیح آبادی، مولانا عبد السلام ندوی، مولانا حسرت موہانی، دیانرائن نگم، ڈاکٹر محی الدین زور نے تحریک کے مقاصد سے اتفاق کرتے ہوئے حوصلہ افزائی کی۔ادیبوں اور شاعروں میں اس کی مقبولیت اس قدر بڑھی کہ جلد ہی دوسرے شہروں میں انجمنیں قائم ہونے لگیں۔۔۔کیفی ان میں سرِ فہرست تھے۔نئی نسل کی انتھک کوششوں سے پہلی کل ہند کانفرنس ۹۔۱۰/اپریل ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔۔۔اس میں اتفاق رائے سے سجاد ظہیر کو کل ہند انجمن کا سکریٹری بنایا گیا۔کانفرنس میں اردو ہندی کے علاوہ بنگالی گجراتی، تلگو، ملیالم، کنڑ اور تامل زبانوں کے بہت سے ادیب شاعر اور فنکار شامل ہوئے۔۔۔اس تحریک کو سب سے زیادہ تقویت پریم چند اور ان کے طویل خطبۂ صدارت سے ملی۔'' (مونوگراف ''کیفی اعظمی'' از صغیر افراہیم)

پروفیسر صغیر افراہیم نے پریم چند کا خطبہ اس مونوگراف میں نقل کیا ہے جسکے یہ جملے ادب کو واقعی ترقی کی طرف مائل کرنے والے ہیں۔پریم چند نے اپنے خطبے میں فرمایا''۔۔۔۔جس ادب

سے ہمارا ذوقِ صحیح بیدار نہ ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے، ہم میں قوت اور حرکت نہ پیدا ہو، ہمارا جذبۂ حسن نہ جاگے، جو ہم میں سچا اور مشکلات پر فتح پانے کے لئے سچا استقلال نہ پیدا کرے وہ آج ہمارے لئے بیکار ہے''۔ اس سلسلہ کی دیگر تفصیلات پریم چند کے رسالہ ''ہنس'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔(پریم چند کا خطبۂ صدارت، ''کیفی اعظمی''مونوگراف از صغیر افراہیم)

کیفی اعظمی کی شادی کے سلسلہ میں پروفیسر صغیر افراہیم لکھتے ہیں'' اکتوبر ۱۹۴۵ میں پانچویں کل ہند ترقی پسند کانفرنس حیدر آباد میں منعقد ہوئی، ۔۔۔۔یہاں مشاعرہ کے دوران ان کی ملاقات اختر حسین کی سالی شوکت خانم سے ہوتی ہے۔۔۔حیدر آباد میں کیفی اعظمی کے کلام کو سن کر ان پر فدا ہو گئیں۔۔۔ ۲۳ مئی ۱۹۴۷ء کو سجاد ظہیر کے گھر۔۔۔میں نکاح ہوا۔''(ایضاً)

متذکرہ شوکت خانم ،کیفی اعظمی کی شریک حیات کے ساتھ ساتھ ان کی بہترین دوست اور خود بھی اعلیٰ ادبی ذوق کی حامل تھیں۔

''میرے شوہر بھی میرے دوست بھی'' کے عنوان سے لکھا گیا محترمہ شوکت کیفی کا مضمون ان دونوں کی رفاقتوں، ذہنی میلانات کی یکرنگی اور ایثار کے جذبے کی عکاسی کرتا ہے۔شوکت خانم اور کیفی اعظمی کی شادی کن حالات میں ہوئی اسکا مفصل بیان، کیفی اعظمی کے آخری ایام میں شوکت خانم کی خدمات، اور ان کے دل پر کیفی اعظمی کی علالت کا جاں کاہ اثر، سب کچھ مونوگراف میں موجود ہے۔

شوکت خانم نے اپنی تحریر میں لکھا ہے کہ'' قوتِ برداشت کیفی میں غیر معمولی تھی۔کیفی جیسے لوگ روز پیدا نہیں ہوتے لوگ کہتے ہیں ایسے لوگ مرتے نہیں امر ہو جاتے ہیں، لیکن مجھے ایسا یقین کب آئے گا کیفی!۔۔۔''

کیفی اعظمی نے بار بار اس بات کو دہرایا ہے کہ شاعری ان کو ورثہ میں ملی ہے۔بچپن ہی سے ان کا میلان شعر خوانی ، شعر فہمی اور شعر گوئی کی طرف تھا۔ان کی شاعری کی ابتدا مدرسہ سلطان المدارس، لکھنؤ کے زمانہ ہی سے ہو گئی تھی۔اس کی ابتدا ۱۹۳۰ء سے مانی جا سکتی ہے۔اس دور کی شاعری میں بھی رومانیت کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری اور واقعہ نگاری موجود ہے۔انھیں عناصر سے کیفی اعظمی میں ترقی پسند نظریات کو فروغ حاصل ہوا۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے کیفی اعظمی کے مجموعۂ کلام ''جھنکار''، ''آخرِ شب'' اور'' آوارہ سجدے'' کے علاوہ دیگر تصنیفات پر بھی گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ ان کی کلیات، ''کیفیات'' کے نام سے شایع ہوئی اور''میری آواز سنو'' کے نام سے فلمی نغموں کا مجموعہ بھی شایع ہوا ہے۔یہی نہیں اس سلسلہ میں پروفیسر شارب ردولوی اور فیض احمد فیض، شبانہ اعظمی

کے نظریات کو بھی قلمبند کیا ہے۔

کیفی اعظمی کو جو ایوارڈ ار ااور انعامات ملے ان کی بھی تفصیل مونو گراف میں موجود ہے۔جس میں پدم شری سمّان اور ساہتیہ اکاڈمی فیلوشپ بہت اہم ہیں۔وشو بھارتی یونیورسٹی اور شانتی نکیتن نے انہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔کیفی اعظمی پر ۹ رفروری ۱۹۷۳ءکو فالج کا حملہ، بغرض علاج روس جانے کا ذکر، تھیٹر سے ان کی اور انکی بیگم شوکت اعظمی کی رغبت، اپنے گاؤں ’’مجواں‘‘ سے ان کا قلبی لگاؤ، اس کی ترقی کی غیر متزلزل خواہش، کیفی اعظمی کی غزلیہ شاعری، نظم نگاری، نغمہ نگای اور نثر نگاری پر اس مونوگراف میں خاطر خواہ روشنی ڈالی گئی ہے۔کہنے کو تو یہ مونوگراف ہے جس میں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہوتی پھر بھی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ پروفیسر صغیر افراہیم نے گاگر میں ساگر بھر دینے کا کام کر دیا ہے۔نیاز فتحپوری نے کیفی اعظمی کی شاعری کو اردو شاعری کی روح، رشید احمد صدیقی نے ان کی غزل کو اردو شاعری کی آبرو، ڈاکٹر یوسف حسین نے موسیقی کا رس اور فراق گورکھپوری نے شاعری کا عطر کہا ہے۔ان کی آئینۂ شاعری سے کائنات کے بیشتر نقوش کا خوبصورت عکس جھلکتا ہے۔

صغیر افراہیم نے کیفی اعظمی کے دور میں غزل پر کئے جانے والے اعتراضات کا بھی تذکرہ کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ کیفی اعظمی نے نعرے بازی کے درمیان بھی غزل کی حرمت کو برقرار رکھا ہے۔غزل کا حسن و جمال، اس کا اختصار و اجمال، اس کی غنائیت و موسیقیت شگفتگی بانکپن اور بحور کے تنوع پر کہیں بھی حرف نہیں آنے دیا نہ ہی علامتوں ،استعاروں اور تلمیحات سے صرف نظر کیا ہے۔پروفیسر صغیر افراہیم نے کیفی اعظمی کی نثری اسلوب پر بھی ایسی روشنی ڈالی ہے جس سے ان کی نثر نگاری کا ہر گوشہ جگمگا اٹھا ہے۔

پروفیسر صاحب نے نظم جدید کی ابتدا، اس کے بتدریج ارتقاء، ترقی پسندوں سے ان کا تعلق اور کیفی اعظمی کا نظم کے ذریعہ اپنی پارٹی کے موقف کی راہ ہموار کرنا اور انسانیت، رواداری، اخوت و محبت کی تبلیغ کرنے کی طرف واضح اشارات کئے ہیں۔ان کی نظموں میں زور کلام، فصاحت، بلاغت اور روانی، کو سراہا ہے۔ان کی نظمیں عوام میں جوش بھرنے کی خصوصیات سے لبریز تھیں، ظلم و تشدد، سماجی ناانصافی پر ضرب کاری تھیں۔ پروفیسر صاحب نے کہیں بھی اپنی تحریر میں بین بین چلنے کا راستہ نہیں اپنایا، جو بھی کہا وہ بہت صاف اور واضح لفظوں میں کہا ہے۔پروفیسر صغیر افراہیم نے کیفی اعظمی کی ہر جگہ تعریف ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ان کی نظموں کا تقابلی مطالعہ کرتے وقت انصاف کے دامن

کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ کا دوسرا اجلاس'' کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ اس نظم کا شمار کیفی اعظمی کی شاہکار نظموں میں نہیں کیا جاسکتا۔کیفی اعظمی کی بارے میں ان کی آراء اوران کی یہ تحریریں''تحریر بہ لوحِ حدید'' کی شان رکھتی ہیں۔پروفیسر صغیر افراہیم نے کیفی اعظمی کے کانپور قیام کا بہت شرح وبسط کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔لکھتے ہیں کہ''حسرت موہانی نہ تو فلم انڈسٹری سے وابستہ ہوئے اور نہ ہی کوئی فلمی نغمہ لکھا۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کانپور میں موجود کئی فنکار،ادیب اور شاعر فلمی دنیا سے منسلک ہوتے گئے۔اس وقت کانپور انقلاب زندہ باد کے نعروں سے گونج رہا تھا اور مزدوروں کی تحریک کا مرکز بنا ہوا تھا۔کیفی اعظمی بھی لکھنؤ سے کانپور آ گئے تھے۔ابتدائً وہ اپنے ماموں سید ولایت احمد اور بڑے بھائی سید ظفر حسین رضوی کے ساتھ پٹکا پور میں رہنے لگے۔'' پروفیسر صاحب نے کانپور کے پریڈ گراؤنڈ،سلطان نیازی کا گھر (موجودہ سوم دتؔ پلازہ)،صدیق ولا (موجودہ امپائر اسٹیٹ)،لال املی،ابراہیم روڈ،مسافر خانہ،پریس منشی دیا نرائن نگم،حسرت موہانی کا مکان واقع کمال خاں کا احاطہ وغیرہ کو اپنے مونوگراف میں جگہ دی ہے جس سے اس زمانے کے کانپور کی یادیں دلوں کے اذہان میں تازہ ہوجاتی ہیں۔

بمبئی آنے کے بعد کیفی مزدوروں میں رہنے لگے،انہیں شعر سناتے اور ان کے دکھ درد کو سنتے''قومی جنگ''،اور بمبئی کی سڑکوں پر قومی جنگ بیچتے پھرتے'' (راج بہادر گوڑ)،۔۔۔ترقی پسند شاعروں نے اپنے مقاصد کی تبلیغ کے لئے فلم کے امکانات سے پوری طرح استفادہ کیا'' (اجمل اجملی)۔۔۔''پرتھوی راج تھیٹر،آر۔کے پروڈکشن،محبوب خان،بی آر چوپڑہ،رامانند ساگر،چیتن آنند،گرودت وغیرہ سبھی مذکورہ نقطۂ نظر کے حامی تھے۔منٹو،کرشن چندر،عصمت،خواجہ احمد عباس وغیرہ کہانی،مکالمے،منظر نامے پر چھائے ہوئے تھے تو جاں نثار اختر،راجہ مہدی علی خاں،راجندر کرشن،پریم دھون،ایس ایچ بہاری،پردیپ،شیلیندر جیسے شاعر فلمی دنیا میں داخل ہو چکے تھے۔غزلوں میں شکیل بدایونی،راجہ مہدی علی خاں اور مجروح سلطان پوری کی دھوم تھی۔۔۔۔جلد ہی کیفی نے بھی فلمی نغموں میں اپنی تخلیقیت کی بنا پر دھاک جمالی۔۔۔وہاں انھوں نے مکالمے،منظر نامے ڈرامے اور کہانیاں بھی لکھیں لیکن فلم 'حقیقت' کے نغموں کی بے پناہ مقبولیت کے بعد وہ بھی ساحرؔ کی طرح اہم اور معتبر ہو گئے۔'' (ایضاً)

ہم دیکھتے ہیں کہ پروفیسر صغیر افراہیم نے کیفی اعظمی کی ابتدائی زندگی سے لے کر بمبئی کے سفر،پھر ان کی علالت اور رحلت تک کے پورے حقائق بہت کم الفاظ میں لیکن بہت جامع طور پر بیان

کر دئے ہیں۔ نیز ان کی نظم معریٰ، فلمی نغمے، موسیقار،گلوکار اور ان فلموں کو بھی اپنے مونوگراف میں مناسب جگہ دی ہے جن سے کیفی اعظمی کا تعلق ہے۔ ان کے بہت سے مقبول نغموں کو ہمارے ذہن میں پھر سے تازہ کر دیا ہے جیسے:۔

ملو نہ تم تو ہم گھبرائیں،ملو تو آنکھ چرائیں/ہمیں کیا ہو گیا ہے
تمہیں کو دل کا راز بتائیں تمہیں سے راز چھپائیں/ہمیں کیا ہو گیا ہے (فلم ہیر رانجھا)
کر چلے ہم فدا جان وتن ساتھیو اب تمہارے حوالے وطن ساتھیو (فلم گرم ہوا)
دھیرے دھیرے مچل اے دلِ بیقرار، کوئی آتا ہے
یوں تڑپ کے نہ تڑپا مجھے باربار، کوئی آتا ہے (فلم انو پما)
یوں ہی کوئی مل گیا تھا سرِ راہ چلتے چلتے
وہیں تھم کے رہ گئی ہے مری رات ڈھلتے ڈھلتے (فلم پاکیزہ)

پروفیسر صغیر افراہیم نے کیفی اعظمی کی شاعری پر گہری تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں کہ ''کیفی اعظمی کا عہد سامراجی طاقتوں کی۔ باہمی کشاکش، ترقی پسندی اور اشتراکیت کے عروج کا زمانہ ہے۔ فکری اعتبار سے ان کے یہاں اقتصادی حقائق کی گہرائی، سماجی اور معاشرتی تقاضوں کا احساس اور جمالیاتی پہلو جلوہ گر ہیں۔ فنی اعتبار سے دیکھیں تو وہ عروض وقواعد سے واقف ہیں اور انہیں مصرعے موزوں کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔۔۔ان کے یہاں شعروادب، اور سماجی ومعاشی تصور کا رشتہ مضبوط ہے کیوں کہ ہر حال میں ان کی سوچ مثبت، انسانی جذبات واحساسات کو متشکل کرنے کا عمل فطری اور لہجہ نرم وخوشگوار ہے''۔ (مونوفراف ''کیفی اعظمی'' از پروفیسر صغیر افراہیم)

پروفیسر صاحب نے کیفی اعظمی کے تیسرے مجموعہ ''آوارہ سجدے'' میں شامل نظموں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ یہی نہیں انھوں نے کیفی اعظمی کی شاعری پر، پروفیسر خلیل الرحمان اعظمی، پروفیسر نفیس بانو، پروفیسر شارب رودولوی، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر سیما صغیر اور انور سدید وغیرہ کے مضامین سے اقتباسات بھی پیش کئے ہیں۔ متذکرہ اہل الرائے نے کیفی کے کلام میں سہل ممتنع، روانی اور تلمیحات کی موجودگی کی طرف واضح اشارے کئے ہیں۔ انہیں، زمانے کا نگراں ، ویتنام اور فلسطین کا ہمدرد، یکسوئی سے سنی جانے والی مثنوی کا خالق، یاس کے اندھیرے سے امید کی روشنی کی طرف لے جانے والا، نشاط وعزم وحوصلہ دینے والا، سماج سے بے لوث پیار کرنے والا، عورتوں کے مسائل اور ان کے حل تلاش کرنے والا، عورتوں کو مردوں کے برابر حق دینے کی

وکالت کرنے والا، شاعری میں ڈرامائی اور مکالماتی پہلو کو فنکاری سے پیش کرنے والا، شاعری میں موسیقیت اور نغمگی کی حفاظت کرنے والا، حسن و جمال اور انقلاب کے نعروں میں توازن رکھنے والا، فرقہ پرستی کا مخالف، تعصب اور تنگ نظری سے فاصلہ بنائے رکھنے والا، فرقہ وارانہ فساد اور بربریت کا مخالف اور غریبوں اور مظلوموں کا بے لوث ہمدرد بتایا ہے۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے کیفی اعظمی کی مجموعی زندگی اور ان کی ادبی اور شاعرانہ منظر نامے کو بہت خوبصورتی سے اس مونوگراف میں پیش کر دیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ بھی اس مونوگراف میں شامل ہے اس کے علاوہ کیفی اعظمی پر اور کچھ نہیں لکھا جا سکتا۔ اور اگر کچھ لکھا جاتا ہے تو وہ پروفیسر صغیر افراہیم کے مونوگراف میں ضرور موجود ملے گا۔ آخر میں مونوگراف کے مصنف نے کیفی اعظمی کی غزلوں، نظموں، مثنوی، اور فلمی نغموں کا خوبصورت انتخاب پیش کیا ہے۔ یہ ایک مشکل کام تھا جسے پروفیسر صاحب نے بخوبی انجام دیا ہے۔ در اصل پتھر سے ہیرا نکال لیا جانا آسان ہے مگر ہیروں کے ڈھیر سے اچھا ہیرا نکال لینا مشکل امر ہوتا ہے۔ کیفی اعظمی کی شاعری سے ان کا بہترین کلام کا انتخاب کرنا ہیروں کے ڈیر سے اچھے ہیرے تلاش کرنے کے مترادف ہے۔ اس انتخاب سے، شاعری پر، پروفیسر صغیر افراہیم کی مضبوط گرفت اور ان کی وسعتِ نظر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے؛۔ کچھ اشعار قارئین کی نذر ہیں جو پروفیسر صغیر افراہیم کی نظروں میں انتخاب ہیں؛۔

غزل:

گر ڈوبنا ہی اپنا مقدر ہے تو سنو ڈوبیں گے ہم ضرور مگر ناخدا کے ساتھ
وہ تیغ مل گئی جس سے ہوا ہے قتل مرا کسی کے ہاتھ کا اس پر نشاں نہیں ملتا

نظم ''سلام''

سلام اس دیس کے ان انقلابی نوجوانوں کو بسا رکھا ہے مدت سے جنھوں نے جیل خانوں کو
سلام ان شہریوں، ان کامگاروں، ان کسانوں پر وبا و قحط نے حملہ کیا تھا جن کی جانوں پر
سلام اس دن پہ جب غیرت نے یوں چھیڑا دلیروں کو
کوئی بے چین کر دے جس طرح خوابیدہ شیروں کو

نظم ''دوسرا بن باس''

پاؤں سرجو میں ابھی رام نے دھوئے بھی نہ تھے کہ نظر آئے وہاں خون کے گہرے دھبے

راجدھانی کی فضا آئی نہیں راس مجھے　　چھ دسمبر کو ملا دوسرا بن باس مجھے

مثنوی ''خانہ جنگی''

خون بوڑھوں کا نوجوانوں کا　　خون بچوں کا بے زبانوں کا
خون دامن پہ آستینو ں پر　　خون گردن پہ خوں جبینوں پر
خوں اہنسائی پر جلالی پر　　خوں ترنگے پہ خوں ہلالی پر
خون مذہب پہ خون ایماں پر　　خون ویدوں پہ خون قرآں پر
چارسو خون چارسو لاشیں　　کو بہ کو خون رو بہ رو لاشیں
ہو کہاں فتنہ دوست راہبرو　　آؤں لاشیں ذرا شمار کرو

کیفی اعظمی پر پروفیسر صغیر افراہیم کا یہ مونوگراف اردو ادب میں ایک اہم سنگ میل اور گلشنِ اردو میں سرخ گلاب کی طرح ہے جس کی خوشبو، خوبصورتی، رعنائی اور تازگی کبھی ماند نہیں پڑے گی۔ میں پروفیسر صغیر افراہیم اور مغربی بنگال اردو اکاڈمی کو اس کار خیر کے لئے دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆

"kadi dhoop ka safar" tajziya aur tanqeedi jaeza by Prof. Iffat Ara

(Ex Prof. dept. of English, AMU,Aligarh)

پروفیسر عفت آراء(سابق پروفیسر شعبہ انگریزی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ)

''کڑی دھوپ کا سفر'' تجزیہ اور تنقیدی نقطۂ نظر

ادب کی یہ خصوصیت ہے چاہے وہ نظم ہو یا نثر، قاری اپنے نظریہ کے مطابق رائے دیتا ہے جبکہ سائنس سے متعلق مواد پر experiments کے ذریعے کوئی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ دونوں انسانی ذہن کی پیداوار ہیں لیکن کتنا مختلف رویہ دونوں اختیار کرتے ہیں۔ یہ بات تعجب خیز ہے کہ بہت سے ادیب اور شاعر سائنس سے استفادہ کرتے ہیں اور اس طرح اُن کی تخلیق بے حد منفرد ہوتی ہے۔ William Blake ایک عظیم شاعر ہیں۔ اُنہوں نے Quantum Physics سے اپنی شاعری کو مزیّن کیا اور دو مختلف موضوعات کا امتزاج ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ اُنہوں نے اپنی مصوّری کے بہترین نمونوں کے ذریعے نظموں کو illustrate بھی کیا۔ T.S. Eliot ڈرامہ نگار تھے، شاعر تھے اور نئے زمانے کے بہترین Critic بھی تھے۔ Shakespeare نے اپنے Career کا آغاز ڈراموں میں acting کے توسط سے کیا۔ پھر شاعری جو اُن کا خاص وصف تھا اُس کے بہترین نمونے طویل نظموں اور sonnets لکھ کر پیش کئے اور آخر میں ڈرامہ نگاری میں perfection حاصل کیا۔ اُن کی قانون کے نکتوں پر گرفت، طب سے واقفیت، فطرت اور آرٹ کی ہم آہنگی، astronomy اور astrology پر عبور اور دربار میں رائج طریقوں کو برتنے کا سلیقہ اُن کے 'smoothwit' میں ڈھل کر ڈراموں میں عیاں ہیں John Keats نے medicine کی تعلیم ترک کی اور شاعری میں عروج حاصل کیا۔ George Bernard Shaw نے drama critic اور music critic, artcritic کی منزلیں طے کیں اور بہترین PlayofIdeas کے مصنف کہلائے اور بے شمار ڈرامے سماج، عقل، سیاست اور مذہب سے متعلق مسائل پر نہایت دلچسپ انداز میں لکھے کیونکہ اُن کی موسیقی سے واقفیت، آرٹ کی معلومات اور ڈرامہ نگاری پر عبور اور اُس کی جھلک ہر ڈرامے میں پائی جاتی ہے۔ اُن کے 'intellectualhumour' نے اُس میں چار چاند لگا دیئے۔ اس سے یہ بات واضح

ہوتی ہے کہ اگر آپ افسانہ نگار ہیں، مضمون تحریر کرتے ہیں اور نقاد بھی ہیں تو ان تمام اصنافِ ادب سے آپ کی وابستگی جاری رہنی چاہئے تا کہ ادب کا ہر گوشہ آپ کے لیے محفوظ ہو اور آپ کا عکس اُس میں عیاں ہو۔

افسانے کی خاص فضیلت یہ ہے کہ وہ پُراثر اور درخشاں ہوتا ہے اور اُسے پڑھ کر بشاشت کا احساس اُس کی صفت ہے۔ یہ آزادانہ طور پر لکھا جاتا ہے اور اس کو سنوارنا، دُرست کرنا مہارت کا کام ہے۔ افسانہ چاہے ہیبت انگیز ہو، جذباتی ہو، حیران کُن ہو، روح کو منّور کردینے والا ہو اُس کا مختصر ہونا شرط ہے تا کہ قاری اُسے جلد پڑھ کر اُس پر رائے زنی کر سکے۔ اس کے لیے ضروری امر یہ ہے کہ کہانی کا ایک واضح خاکہ بنایا جائے جس میں خیالات کی جدّت کی گنجائش ہو، Climax ہو، وقفے کی علامت ہو۔ ان تمام تفصیلات سے مراد یہ ہے کہ کہانی کا ایک plot ہو جو اس انداز سے ترتیب دیا جائے کہ زندگی کی مختصر تصویر پیش کر سکے جیسے ہم خوردبین کے ذریعے دیکھ رہے ہیں ناتراشیدہ یا بےہنگم طریقے سے نہیں تو گویا plot کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ اس کے حصار میں تمام تشبیہات، personification، استعارے اور دوسری ترکیبیں اور کردار بھی اس طرح پیش کے جائیں کہ قاری کی توجہ قائم رہے۔ کہانی ایک اخلاقیات کا درس بھی دیتی ہے۔ اب یہ تو گویا بنیاد ہوئی جس پر کہانی کا محل تعمیر ہوگا۔ اس کے بعد فضا یا ماحول پر توجہ کے نتیجے میں افسردہ مزاجی، تصّوف، نااُمیدی، بےمعنی وجود کا احساس، ناپائیداری پائی جاتی ہے جس کے تحت کردار بظاہر بے پروا نظر آتے ہیں لیکن اس غم گینی کو دور کرنے کے لیے لاحاصل سازشیں کرتے ہیں۔ جو مصنف کہانی کہنے اور کرداروں کو اُن کے تجربات کی روشنی میں پیش کرنے کی بھرپور صلاحیت نہیں رکھتے وہ صرف صفتِ بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔

جدید دور کی کہانیاں ان قید و بند سے آزاد ہیں۔ یہ اُن ترقی یافتہ اور تعلیم سے آراستہ لوگوں کے لیے لکھی جاتی ہیں جو تیز گام زندگی کا کہانی کار کے ذریعے ایک تنقیدی جائزہ لے کر آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔ مسائلِ زندگی حل ہوں یا نہ ہوں وہ تیزی سے وقت کی دوڑ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اب وہ پُرانے tools جو افسانہ نگار استعمال کرنا اپنی شان سمجھتے تھے انہیں رد کر دیا گیا ہے۔ یہ خیال عام ہے کہ کہانی زندگی کا عکس ہے یا جیسا افسانہ نگار زندگی کا تصّور ذہن میں رکھتا ہے لیکن یہ خیال بھی رائج ہے کہ زندگی کی نہ کوئی باقاعدہ شروعات ہے نہ کسی قسم کا اختتام اسی لیے جدید دور میں لکھی گئی کہانیاں بے ربط ہیں اُن کی ابتدا اور انتہا کا سُراغ لگانا مشکل مرحلہ ہے اور وہ زندگی کے مسائل کے شکار

کرداروں کی ناکامی، محرومی اور شکست کا عکس ہیں اسی کے ساتھ یہ خیال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کہانی چاہے کتنی بھی سپاٹ اور مختصر نظر آئے اُس کے اندر معنی پوشیدہ ہوتے ہیں ممکن ہے کچھ کہانیاں بالکل بے مقصد نظر آتی ہوں لیکن پھر بھی وہ دلچسپی کا باعث ہوتی ہیں کیونکہ اُن میں بیان کیا گیا تجربہ موثر ہوتا ہے۔

جدید دور کی کہانی میں psycho-analysis کے اُصول بڑی کثرت سے استعمال ہو رہے ہیں جس کے تحت یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ جو ہمارے consciousmind میں ہو رہا ہے اُس کی جڑیں unconscious mind میں موجود ہیں اسی سبب جو abnormal لوگوں اور بچوں سے متعلق واقعات ہیں وہ قابلِ توجہ ہیں۔ Existentialism کے عنصر بھی جدید کہانی میں پائے جاتے ہیں جو انسان کو کسی نہ کسی situation یا صورتِ حال میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ انسان اُس کا مقابلہ کرتے ہیں تو یہ اُن کے قابلِ اعتماد وجود کی سند ہے اور اگر اس کے برعکس کرتے ہیں تو وہ نا قابلِ اعتبار قرار دیئے جاتے ہیں یعنی وہ بس exist کرتے ہیں۔ یہ situations جس میں کہانی کے کردار اپنے آپ کو پھنسا ہوا پاتے ہیں وہ struggle, guilt, death وغیرہ ہوتی ہیں۔ اس situation کو face کرنا فتح مندی ہے ورنہ آپ کمزور قرار دیئے جائیں گے اور آپ کا وجود بے معنی ہے۔ یہ نکتے تنقید نگار پیدا کرتے ہیں۔ افسانہ نگار تو انسانی وجود سے وابستہ کش مکش کو تب سمجھ سکتا ہے جب وہ اس Philosophical concept کو جانتا ہو اور پھر ادب کی روایت کے تحت اپنے کرداروں میں اُسے رائج کرنے کا ہنر بھی جانتا ہو۔ بعض اوقات بے خبری کے عالم میں یا غیر ارادی طور پر یہ خصوصیات اُس کے کرداروں کے رویہ سے ظاہر ہوتی ہیں اور نقاد اُنہیں تلاش کر کے کرداروں سے منسوب کرتا ہے۔

اس پس منظر میں ممتاز ادیب پروفیسر صغیر افراہیم کے افسانوں کے مجموعے ''کڑی دھوپ کا سفر'' کا تجزیاتی مطالعہ مقصود ہے۔ مجموعہ کا آغاز اُن کی کہانی ''وہ خواب'' سے ہوتا ہے۔ یہ خواب و حقیقت کا تصادم نہیں بلکہ ایک تلخ حقیقت ہے جس کی پیش بندی خواب کے ذریعے ہوئی تھی۔ لیکن اس میں دونوں فریق اس shocking situation کے ذمہ دار ہیں۔ ہیروئن کو اس کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اُس کا شوہر کسی بُرے فعل میں ملوث نہیں ہے اور اگر چہ وہ ایک لمبی duty پوری کرنے کے بعد گھر آتا ہے لیکن وہ پاک صاف انسان ہے۔ وہ اپنے گھر کو اپنی بیوی کی موجودگی اور کارکردگی سے جنت نشاں بنانے کا خواہش مند ہے۔ اُس کی بیوی تعلیم یافتہ خاتون ہے۔ اگر وہ ایک عمدہ routine

مرتب کرتی جس میں تعلیم سے متعلق مصروفیت بھی شامل ہوتی تو زندگی کتنی خوشگوار تھی۔ملازمت حاصل کرنے کے بعد اگر خراب ماحول میں اُس کی عصمت وعزت خطرے میں پڑ جاتی جس کا اکثر امکان ہوتا ہے تو کیا وہ ذہنی توازن قائم رکھ سکتی تھی؟ اُس کے شوہر کو طیش میں آ کر اُس پر ہاتھ نہیں اُٹھانا چاہیے تھا۔کیا وہ بھول گیا کہ مذہب اسلام میں عورتوں کے سلسلے میں equality کا واضح تصّور ہے۔ دونوں کو باہم گفتگو کے ذریعے اپنے مسائل پر تبادلۂ خیال کرنا بہتر عمل تھا۔دوسری کہانی ''پیسے کی پیاس'' بڑی سبق آموز ہے۔زبان وبیان بہت متاثر کن ہے۔دولت انسان کے ہر جذبے کو سرد کر دیتی ہے اور ہر رشتے کو کمزور بنا دیتی ہے۔اسی لیے اسلام میں دولت سے محبت کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے اور میانہ روی اختیار کرنے کا درس ہر مسلمان کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوتا ہے۔تیسری کہانی '' انجان رشتے'' مقدس رشتوں کا reflection ہے۔دونوں اعلیٰ ظرف مرد وزن انسانی پیکر میں دو فرشتے تھے۔لیکن اپنے بیٹے سے تمام تفصیلات پوشیدہ رکھنے کا عمل کچھ بہت سودمند ثابت نہیں ہوا۔وہ اپنے والد سے بدظن ہو گیا اور جُدائی نے جو دیوار دونوں کے درمیان حائل کی وہ آخر میں ختم ہوئی۔ جب تک محبت کا قیمتی سرمایہ ضائع ہو چکا تھا۔اپنی سوتیلی ماں کے غم کو بھی بیٹا share نہ کر سکا اور وہ ایک اچھا تاثر قائم کرنے کے باوجود بہت دیر میں ایک goddess کے روپ میں اُس کے سامنے آئیں۔افراہیم صاحب European writers کی طرح مختصر کہانی میں ایک نیا نکتہ پیدا کرتے ہیں اور انسانی نفسیات اور اُس کے مسائل کا بڑا اچھا نقشہ پیش کرتے ہیں۔

کہانی ''ہار جیت'' بھی بہت دلچسپ ہے۔بچے فطری طور پر ماں کی طرف مائل ہوتے ہیں۔وہ شروع سے ان کی نشوونما کرتی ہے اور ایک نرم گوشہ اُس کے دل میں ہمیشہ اپنے بچوں کے لیے رہتا ہے جو کسی بھی مختصر سختی پر غالب آ جاتا ہے۔باپ کو اس سلسلے میں سخت یا نرم رویہ اختیار کر کے طرزِ زندگی کو مایوس کُن نہیں بنانا چاہیے۔مرد اور عورت اگر ایک گاڑی کے دو پہیہ ہیں تو بچے جو اُس پر سوار ہیں اُس کا توازن کبھی قائم رکھتے ہیں کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے۔گویا محتاط رویہ اختیار کر کے گاڑی اور اُس کے مسافر اُس کی سالمیت کو برقرار رکھیں ورنہ کھیل بگڑ جائے گا۔ان کہانیوں میں مرد عام طور سے سخت مزاج پائے جاتے ہیں جو اپنی انا کا شکار ہیں اور بغیر غور وخوض کے غلط فیصلے کرتے ہیں اور پھر اُس کا خمیازہ بھگتے ہیں۔عورتیں بھی اکثر غلط راہ کا انتخاب کرتی ہیں اور پشیماں ہوتی ہیں۔ افراہیم صاحب اپنے تجربات اور مشاہدے کے ذریعے canvas پر کردار اور واقعات پیش کرتے ہیں جو زندگی کے مختلف رنگ ہیں کبھی پُرکشش کبھی بے کیف۔اب انہیں کے درمیان ہمیں سچائی تلاش

کرنی ہے۔

کہانی ''سفر ہے شرط......'' میں موضوع کا انتخاب ہر شخص کو اپنی طرف مائل کرتا ہے۔ یہ عام تجربہ ہر فرد کے مزاج کے لحاظ سے خاص تجربہ بن جاتا ہے۔ طرزِ بیان کے جادوئی اثر سے بشارت حسین کی زندگی کے بدلتے رنگ بڑے سلیقے سے پیش کے گئے ہیں۔ وہ اپنی مصروف زندگی کے عادی تھے لیکن اُس میں حائل ناپسندیدہ تجربات طبیعت پر گراں گزرنے کے باوجود قابلِ برداشت تھے۔ وہ مستعدی سے اپنے فرائض انجام دینے کے بعد تمام شور شرابے اور ہمہ ہمی کو خیر باد کہہ کر شام کو دفتر سے اپنے گھر کے پُرسکون ماحول میں واپس آ کر تمام بدمزگی کو فراموش کر دیتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد یہ یادیں دل میں کسک پیدا کرنے لگیں اور وہ اپنے محور کی طرف گئے اور واپس آ گئے لیکن وہ تلاشِ بہاراں بیگم کے خوشگوار وجود سے میسر ہوئی جس کو اب سکون سے وہ اپنے اندر جذب کر سکتے تھے۔ اپنے نام کے مطابق اُنہیں ایک نئی سمت کی طرف گامزن ہونے کی بشارت ہوئی۔ Shakespeare بھی اپنے ڈرامے کے کرداروں کے نام اُن کی کارکردگی کے لحاظ سے منتخب کرتے ہیں۔ Desdemona (moan) ہمیشہ غمگین رہتی ہے اور اشک بار رہنا اُس کا نصیب بن گیا۔ Viola (violet) اُس شاداب پھول کی طرح ہے جو Duke Orsino کی بے رونق زندگی کو تروتازہ کر دیتی ہے۔

''سفر ہے شرط'' کی طرح کہانی ''منزل'' بھی بہت خوب ہے۔ فطرت کی منظر کشی محض رسمی نہیں ہے بلکہ World of Nature کا World of humans سے گہرا تعلق بیان کیا گیا ہے۔ سورج کا بدلتا رنگ اُس کے حسبِ حال تھا گویا وہ اُس کے ہونے والے حشر پر خون کے آنسو بہا رہا تھا، فطرت کی رعنائی کے پسِ پشت اُس کی ویران اور ناکام زندگی نے اُسے موت کی طرف راغب کر دیا تھا۔ وہ اپنا خاتمہ کرنے کے لیے رواں پانی کی آغوش میں پناہ لینا چاہتا تھا اور ارادہ پختہ تھا کہ کسی معصوم بچی نے اُس کا ہاتھ تھام لیا اور اپنی مفلسی اور بھوک کا اظہار کیا۔ اس طرح innoncence اور experience کا نہ صرف مقابلہ ہوا بلکہ اُسے محسوس ہوا کہ دونوں اپنی منزل کی تلاش میں ہیں اور اُس کے وجود کے برقرار رہنے سے دونوں پُرسکون ہو جائیں گے۔ صغیر افراہیم صاحب کے افسانوں کا خاص وصف یہ ہے کہ ہر پلاٹ اور ہر کردار مختلف ہوتا ہے لہٰذا کوئی repetition نہیں ہے۔ اُن کی قوتِ مشاہدہ فطرت کی خوبصورتی اور انسان کی نفسیات دونوں پر یکساں طور سے متوجہ رہتی ہے۔ ایک اور کہانی ''خوابیدہ چراغ'' ایک ماہرِ نفسیات کے treatment اور observation

کا نتیجہ پیش کرتی ہے۔ بچوں کے درمیان تفریق کرنا اور حساس بچوں کو نذر انداز کرنا بڑا ہی ناپسندیدہ عمل ہے۔ وہ اگر self-defence کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں۔ یا تنقید کا نشانہ بن کر غیر محفوظ ہوجاتے ہیں اور اپنے خول میں پناہ لے کر اپنی خوبیوں کو ظاہر کرنے کی صلاحیت کھو دیتے ہیں تو بقول Wordsworth وہ اُس violet (پھول) کی مانند ہیں جو غیر آباد جگہ moss کے درمیان نمودار ہوکر ایک طرح سے گمنام ہوجاتے ہیں۔ شاعر نے Lucy poem میں اس خیال کو بڑے لطیف انداز میں پیش کیا ہے۔ ''انکشاف'' بھی ایک نئی طرز کی کہانی ہے۔ ایک عورت کا ایثار، مرد کی مجبوری اور دوسری عورت کا idealization اُس کے ساتھ بے باکی پھر repentance کچھ عجیب سما پیدا کرتی ہے۔ مالتی اُس بیل کی طرح ہے جو پھولوں سے لدی رہتی ہے۔ خاموشی سے ہر موسم میں سرسبز وشاداب نظر آتی ہے۔ اُسے کسی توجہ یا دیکھ بھال کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ وشال اپنے نام کے مطابق impressive تھے مگر زوال پذیر ہوگئے۔ آشا اُن سے متاثر ہوکر اُن کے التفات کی منتظر تھی اور جب خود یہ پیش کش کی تو مایوس ہوکر بکھر گئی۔ صغیر افراہیم کے قلم کا کمال ہے کہ خوبصورت الفاظ اور چند جملوں میں ہر کیفیت بیان کر دیتے ہیں۔ افسانہ ''آخری پڑاؤ'' ایک تلخ حقیقت کا عکس ہے۔ صبا کے والدین کا مکان بے نام ہے اور اُس کے مکین بے مقصد زندگی گزار رہے ہیں۔ جو شجر اُنہوں نے لگایا تھا اُس کے سائے میں وہ تنہا کھڑے اپنے بچوں کی آمد کے منتظر ہیں۔ تنہائی انسان کو خاکستر کر دیتی ہے لیکن اُن کے متعلقین اس غم سے بے خبر ہیں۔ وہ اپنے باغِ جنت میں کسی کی شرکت کے روادار نہیں ہیں۔

مصنف کا پیغام صحیح ہے کہ وہ خود اپنے آئندہ حشر کو ذہن کے کسی گوشے میں بھی جگہ نہیں دیتے ہیں۔ صغیر افراہیم زندگی کے ہر تجربے کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہیں اور پھر اُسے کہانی کے framework میں پیش کرتے ہیں۔ یہاں کردار اور واقعات اُن کی اس کاوش میں شریک ہیں۔ EmilyBronte کے بہترین ناول بہ عنوان WutheringHeights میں بھی بربادی کا ایسا منظر ہے کہ گھر کے اندر اور باہر کرداروں کی ضد، انا، غرور، اور خود پسندی کی وجہ سے سب کچھ مسمار ہوجاتا ہے لیکن دو ۲ جوان کردار اس یکسانیت میں اپنے وجود سے ارتعاش پیدا کرتے ہیں اور اُمید کے چراغ روشن کرتے ہیں کہ اُن کی آپس میں وابستگی سے منتشر خاندانوں اور رہائش گاہوں کے شکستہ کنگورے دوبارہ اپنی سالمیت حاصل کرلیں گے۔

''جگ سونا ہے تیرے بغیر'' ایک ایسی متاثر کُن کہانی ہے جو ایک disabled شخص کے جذبات اور

نفسیات کی عکاسی کرتی ہے۔ اچھے حالات میں پرورش پانے کے بعد تقدیر کی ستم ظریفی کا شکار ہونا ایک ایسا المیہ ہے کہ وہ انسان کی خوبیوں کو خامیوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ وہ اپنے گرد پھیلی ہوئی خوشگوار اور پُر کیف زندگی سے بیزار ہو جاتا ہے کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ وہ objectofpity بنا رہے اور دوسرے لوگ جو خوشیوں سے آراستہ ہیں اُس کا دیدار کریں۔ وہ اپنے آپ کو مصروف رکھتا ہے۔ سب سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے اور پھر شادی کے بعد بھی وہ یہی رویہ اپنی پاکیزہ اور جانثار بیوی کے سلسلے میں رکھتا ہے اور جب اُس کی بیوی اولاد پیدا نہ کر سکنے کے جرم کی مرتکب ہوتی ہے تو یہ ایک اور حادثہ پیش آتا ہے جو اُسے مزید گوشہ نشین اور تنگ مزاج بنا دیتا ہے۔ اُس کی وفا شعار بیوی غم و رنج کی تاب نہ لا کر برین ٹیومر کے مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے اور یہ آخری واردات شوہر کو لاغر کر دیتی ہے۔ اسی کیفیت کو Thomas Hardy نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے جو واقعی دُرست ہے: Happines isbutanoccasionalepisodeinthegeneraldramaofpain ''نیا راستہ'' ایک ایسی باہمت اور باشعور عورت کی کہانی ہے جس نے اپنے شوہر کے ناروا سلوک جو اُس کی خوبیوں کے باوجود اُس کا احاطہ کئے تھا اُسے برداشت کرتی ہے۔ اپنے بچوں کے مستقبل کو سنوارتی ہے۔ اپنے فرائض مستعدی سے انجام دیتی ہے اور اپنا حالِ دل دوسروں سے بیان کئے بغیر، شوہر کی بے وفائی کی داستان کو فراموش کرنے کے بعد خاموشی سے اپنی راہ کا تعین کر لیتی ہے، یہ صفت مغرب کی عورتوں کا خاص مزاج ہے جو اپنے فیصلے خود کرتی ہیں اور تمام تفکرات کی پردہ پوشی کر کے آگے بڑھ جاتی ہیں۔ صغیر افراہیم نے اس کہانی میں تشبیہات کا استعمال بڑے مناسب انداز میں کیا ہے اور 'وقت' جو ایک علامت کے طور پر مختلف ادیب اور شاعر پیش کرتے ہیں اُس کے دو ۲ پہلو بیان کئے ہیں۔ وہ تیز گام ہے اور ظالم ہے لیکن انسان اگر چاہے تو اُسے مات دینے کے لیے اُسے رد کر سکتا ہے اور اُس کی دی ہوئی تکلیفوں سے فرار حاصل کر سکتا ہے۔

''شجرِ سایۂ دار'' ایک خوبصورت افسانہ ہے جس میں فطرت کے شاہکار اُس نیم کے درخت کا فنکارانہ description ہے جو نہ صرف بے شمار فوائد سے بھرپور ہے بلکہ اُس خاندان کی میراث ہے جس کو وہ protection دیتا ہے۔ ساجدہ اُسے اپنے شوہر کا پرتو قرار دیتی ہے جس کے وجود سے وہ یادیں وابستہ ہیں جنہیں وہ فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ جب اُس کی مخالفت کے باوجود اُسے کاٹ دینے کا اعلان ہوا تو وہ غموں سے نڈھال ہوگئی۔ لیکن جب دل سے صدا بلند ہوئی تو ایسا معجزہ ہوا کہ اُس کے بیٹے نے جو امریکہ سے آیا تھا شجر کاری کی اہمیت پر lecture دیا۔ امریکہ میں اس کو کس

قدر مقبولیت حاصل ہے اور شجر کاری پر کن کن زاویوں سے research ہورہی ہے اور کیسے اس درخت سے جدید ادویات تیار کی جارہی ہیں،مختصر مگر موثر بیان ہے۔ وہ پختہ ارادہ کر چکا تھا کہ نیم کے اور درخت بھی اپنے گھر میں اُگائے گا اور اُنہیں اُن کی تمام خوبیوں سمیت قابلِ قبول بنائے گا۔

ایک اور کہانی ''وہی فاصلہ ہے کہ جو تھا'' اُن فرسودہ خیالات اور روایات کی طرف توجہ مبذول کراتی ہے جو ہمارے مسلم معاشرے میں رائج ہیں۔ خاندانی تنازعہ کی شکار ایمن ذرا سی دیر میں اپنا خوابوں کا محل کھو دیتی ہے۔ اس میں یہ نکتہ بھی پوشیدہ ہے کہ بچے والدین کے کچھ عادات وخصائل inherit کرتے ہیں۔ اشرف کے والد نے خاندانی روایت سے بغاوت کی تھی۔ اشرف نے ایمن سے کنارہ کشی اختیار کی اور اپنے خیال میں خاندانی وقار کو برقرار رکھا۔ باغی دونوں تھے۔ دونوں کو عورت کے نازک جذبات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔صغیر افراہیم صاحب کے افسانوں پر غم کے سائے ڈولتے ہیں کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ غم اور پریشانیاں ہی ہر طرف سایہ افگن رہتی ہیں یہ انسان کا مقدر ہے ورنہ شاید وہ خوشی کی اہمیت سے ناواقف رہتا۔ افراہیم صاحب خوبصورت زبان کے ذریعے غم کی تیرگی کو کسی قدر کم کردیتے ہیں اور جزاوسزا کے اسلامی نظریہ کا بھی اکثر استعمال کرتے ہیں۔ افسانہ ''بے نام رشتہ'' بے حد متاثر کُن ہے۔ والدہ کے ایثار کو فرقان نے عملی جامہ پہنایا اور محنت اور اپنی کاوش سے اونچے درجات حاصل کئے۔ ماں حادثے کا شکار ہوگئی اور اُس کا وجود فنا ہوگیا اور اس سانحہ نے فرقان کو سنجیدہ، ذمہ دار اور Thomas Hardy کے کردار father-old-time (جو ایک بچہ تھا وقت سے پیشتر بُردبار ہوگیا تھا) کی طرح maturinty کا لبادہ پہنا دیا۔ وہ اپنی ماں کی کمی کو محسوس کرتا رہا اور تنہائی نے اُس کا احاطہ کرلیا لیکن لاجو کے روپ میں اُسے اپنی کھوئی ہوئی ماں مل گئی۔ ماں جو ایک مقدس شے ہوتی ہے اور اُس کے وجود سے ہر غم کا مداوا ہوجاتا ہے۔صغیر افراہیم کی یہ زبردست خوبی ہے کہ وہ ہر کردار کو اپنے اندر absorb کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور پھر وہ اُس کے جذبات کی عکاسی زورِ قلم سے ایک مصور کی طرح کرتے ہیں۔ دراصل experience ہی انسان کو maturinty کی سند حاصل کرنے اور ایک perfection کی تکمیل میں مدد فراہم کرتا ہے۔ ایک اور کہانی ''بے بسی کی قطار'' اسقدر pathetic ہے کہ پورا وجود غم میں ڈوب جاتا ہے۔ اتنی جدوجہد کے باوجود جمشید اپنی عزیز شریک حیات کو بیماری سے نجات نہ دلا سکا اور موت نے بڑی سفّاکی سے ناہید کو زندگی سے محروم کردیا۔ یہ مشینی دور کی کرامات ہیں۔ کوئی اس پر فاتح ہے اور کوئی اس کے آگے سپر ڈال دینے پر مجبور ہے۔ افراہیم صاحب اکثر ایک objective observer کی طرح

اپنے کرداروں کی ناکامی اور محرومی کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ ان کرداروں کے صادق جذبات وقت اور زمانے کی کجی کے باعث فنا ہو جاتے ہیں۔

’’رام دین‘‘ ایسی کہانی ہے جو conversion پر تو مبنی نہیں ہے لیکن لفظوں کے اُلٹ پھیر سے ایک نیا انکشاف ہوتا ہے کوئی رام دین ہو یا دین محمد، خوبیاں ہر انسان میں پائی جاتی ہیں اور وہ اُسے سب کے درمیان مقبول بناتی ہیں۔ ممکن ہے اُس کے نام بدلنے میں مصلحت بھی پوشیدہ ہو۔ اُس نے گویا سب مذاہب کے لوگوں کے ساتھ وقت گُزارا اور پھر آخر اپنے راز کو افشاں کیا تا کہ سب جان سکیں کہ ایک اچھے انسان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے۔ صغیر افراہیم کے افسانوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ہر پلاٹ نیا ہوتا ہے اور suspense قائم رکھ کر وہ قاری کی توجہ برقرار رکھتے ہیں۔

’’وہ اچھا لڑکا نہیں ہے‘‘ ایک ایسی کہانی ہے جس میں دو لڑکوں کا موازنہ کیا گیا ہے اور یہ مثل اُن پر صادق آتی ہے۔ ’’بد اچھا بدنام بُرا‘‘ والدین تعلیم حاصل کرنے کے لیے لڑکوں کو اپنے سے جُدا کرتے ہیں تو اس کے مُضر اثرات کو بھی خوبی کے ساتھ یہاں بیان کیا گیا ہے۔ بچے والدین کی نظروں کے سامنے رہیں یہ بہتر ہے۔ ارشاد نے اپنے عیبوں کی پردہ پوشی کی اور عرفان کو مجرم ثابت کیا لیکن مصنف نے اچھائی کی فتح کے ذریعے گویا اس طرف بھی توجہ مبذول کرائی کہ عرفان کیونکہ بنیادی طور پر نیک دل تھا اس لیے اُس نے ارشاد کے پھندے میں پھنسنے سے دوسرے لڑکوں کو بچا لیا گو کہ وہ خود اس دلدل میں گرفتار ہو کر باہر نکلنے سے قاصر تھا۔ صغیر افراہیم اپنے گہرے مطالعہ اور وسیع مشاہدے کے ذریعے حالات اور انسانوں کا تخلیقی اظہار کرتے ہیں جو قابلِ ستائش ہے۔

’’روشنی‘‘ اس قدر غموں سے پُر کہانی ہے کہ اس کا ثانی نہیں۔ اپنی مہربان benefactress کو روشنی سے ہمکنار کر کے خود راشد اس ضیاء سے محروم ہو گیا جو اُس کی اور اہلِ خانہ کی زندگی کے لیے بے حد ضروری تھی۔ وہ ایثار اور قربانی کا پیکر مجبور و بے بس ہے اور بقول Thomas Hardy: Man is a puppet in the hands of fate—ایک کہانی ’’سُرخ تاج‘‘ گویا تاج محل سے وابستہ بادشاہ اور ملکہ کی پاک محبت سے مختلف ہے۔ بادشاہ نے اپنی ملکہ کو تاج محل کے خوبصورت مقبرے میں دفن کرنے کے بعد یہ حسین فنِ تعمیر کا نمونہ بنوایا جو اُن کے جذبوں کی صداقت کا امین تھا۔ وہ اپنی بیگم کی برسی کے موقع پر زار و قطار روتا تھا اور بے دریغ روپئے تاج محل پر صدقے کے طور پر تقسیم کرتا تھا۔ ممتازِ محل اُس کی بہترین مشیر اور پُر خلوص شریکِ حیات تھی۔ عامر کی محبت یک طرفہ تھی اُس نے ایک سطحی اور insensitive لڑکی کا انتخاب کیا تھا جو فنونِ

لطیفہ کی طالبہ ہوکر بھی اُس کی نفی تھی۔ ایک خوبصورت سراپے کے اندر وہ ایک بدصورت فطرت کی مالک تھی۔ عامر ایک ایسا جوہری تھا جو ہیرے کی چمک سے متاثر ہوکر اُس کے نقلی ہونے کے احساس سے بے بہرہ رہا اور جب اُسے ہوش آیا تو تاسف اور پشیمانی کے سوا اُس کے پاس کچھ باقی نہ تھا۔ اُس کی محبت کا تاج سُرخ لہو سے تر تھا۔ اُس کی محبت شہید ہوچکی تھی۔ افراہیم صاحب زندگی کے جھروکے سے ہر طرح کے کرداروں کی جھلک پیش کرتے ہیں جو پُرکشش بھی ہیں اور ناپسندیدہ بھی، جو نیکی اور بدی کے مختلف عکس ہیں۔ اسی لیے George Bernard Shaw کی رائے ہے کہ جب انسان میں reason اور passions کا امتزاج برابر ہوتا ہے تو وہ شخص normal ہے ورنہ وہ اس کے برعکس کہلائے جانے کا حقدار ہے۔

''میرا کرب'' ایک اچھا افسانہ ہے جو ایک تنہا اور بے بس عورت کی پریشانیوں کی داستان ہے۔ اُس کی صابر وشاکر بیٹی صائمہ نے اپنے فہم وادراک کی روشنی میں جو بھی حالات تھے اُنہیں قبول کیا اور اپنی والدہ کو حج کی سعادت سے سرفراز کرانے کا فرض ادا کیا۔ اُس نے اُن زیورات کا جو اُس کی نذر ہونے والے تھے۔ اُن کا بہتر استعمال کیا تاکہ اُس کی والدہ بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہوکر اپنے کرب سے کسی قدر نجات حاصل کریں ''کڑی دھوپ کا سفر'' ایسی کہانی ہے جس میں مرد کی سمجھداری اور حاضر دماغی اور سماج سے مخالفت اچھے نتائج برآمد کرتی ہے۔ حمیرا خوبصورتی کا پیکر، مگر بیماری میں مبتلا تھی لیکن یہ بیماری اکثر شادی کے بعد شوہر کی خاص توجہ اور اس رشتہ کے قائم ہونے سے ختم ہوجاتی ہے۔ اسلم نے کیونکہ سچائی کا دامن تھامے رکھا تو اللہ تعالیٰ نے اُس کی بیوی کو صحت وتندرستی اور خود اُسے ایک خوبصورت بچے سے نوازا اور تمام تفکرات جو دوسروں نے پیدا کیے تھے اُن کا سدِ باب ہوگیا۔ فن اور فنکار کے نبض شناس صغیر افراہیم عورت اور مرد کا بڑی دیانت داری سے فنکارانہ اظہار کرتے ہیں۔ وہ سب کو ایک ہی کسوٹی پر رکھ کر اُنہیں judge کرتے ہیں۔ اُن کے یہاں preferences کا خانہ نہیں ہے اور وہ کسی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے افسانوں میں عام آدمی کے مسائل پر focus کیا ہے کیونکہ اُنہیں کی اکثریت ہے اور وہ مسائل کبھی حل ہوجاتے ہیں کبھی ایک تشویق ناک صورتِ حال اختیار کرتے ہیں۔ George Bernard Shaw کا بھی یہ طریقِ کار ہے کہ وہ characterization اور discussion کے ذریعہ مسائل پیش کرتے ہیں کچھ options بھی دیتے ہیں لیکن کوئی رائے قاری پر نہیں تھوپتے ہیں۔ آپ کی مرضی ہے اُن کی تحریر پڑھ کر آپ اپنے مزاج کے مطابق فیصلہ کریں کہ کون سا عمل یا کون سا option بہتر اور قابلِ قبول

ہے۔ پروفیسر صغیر افراہیم کے ان چھوٹے چھوٹے افسانوں میں ایک دُنیا سمائی ہوئی ہے کیونکہ چاہے مشرق ہو یا مغرب انسان کا خمیر تو ایک ہے۔ وہ ایک مٹی سے بنا ہے اور ایک ہی طرح فنا ہو جاتا ہے۔ سب کی نفسیات، سب کے غم اور خوشی، نرمی و محبت اور خوبصورت یا کمزور خیالات، عادات وخصائل یکساں ہوتے ہیں بس ادیبوں اور شاعروں کا style of presentation مختلف ہوتا ہے۔ افراہیم صاحب کی پیش کردہ غم سے معطر فضا ہر کہانی کا احاطہ کئے رکھتی ہے کیونکہ بقول غالبؔ:

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف! آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

''کڑی دھوپ کا سفر'' مجموعے میں شامل کہانیوں کا تجزیہ کرنے کے بعد اگر ان کا ادبی و تنقیدی محاسبہ کیا جائے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں کوئی فلسفیانہ تصورات اور فکری نظریات سے مدد لی گئی ہے، مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تخلیقی فن ان تصورات و نظریات کے بغیر بھی ممکن ہے، انسانی نفسیات، جذبات اور احساسات کا فنکارانہ بیان ہی تخلیق کو اہم بناتے ہیں جن سے صغیر افراہیم کے افسانے ہرگز مبرا نہیں، یقیناً زمانے کے ساتھ ساتھ طرز اظہار میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ،مگر آدمی کی جبلّت اور نفسیات میں نہیں، زیر مطالعہ یہ چھوٹے چھوٹے افسانے تین دہائی قبل تخلیق کئے گئے ہیں، بے شک، معاصر فکشن کے رموز و کنایات اور اسلوب و تکنیک کی روشنی میں ان کا جائزہ نہیں لیا جا سکتا لیکن ہر دور کے افسانوں میں انسانی نفسیات مشترک رہی ہے، صغیر افراہیم کے افسانوں میں اس کا التزام بڑی خوبصورتی سے ملتا ہے۔ ان کی تمام کہانیاں ایک مخصوص تہذیب و ثقافت اور روایات کا احساس دلاتی ہیں، آزادی کے بعد ہندوستانی معاشرت پر مغربیت کے منفی اثرات کے زیر اثر مشرقی تہذیب کی زبوں حالی پر افسانہ نگار کی گہری نظر ہے نیز مسلم خاندانوں میں در آئی رسّہ کشی کلیدی حیثیت رکھتی ہے، ظاہر ہے ان تمام مسائل سے بیداری کا فریضہ فنکار انجام دیا کرتا ہے، صغیر افراہیم کے یہ افسانے اسی پس منظر میں مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں۔ پریم چند سے لے کر قاضی عبدالستار تک، زیادہ تر افسانہ نگاروں نے مذکورہ معاشرت کو نت نئے مشاہدات کی روشنی میں اپنی اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کے تحت اُجاگر کیا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پریم چند، بیدی، منٹو، کرشن اور عصمت نے فلسفہ طرازی کی، انہوں نے بھی عام انسانوں کے کرداروں کو اثر انگیز طریقے سے نمایاں کیا ہے۔ اس پس منظر میں کہا جا سکتا ہے کہ راست بیانیہ میں بھی صغیر افراہیم صاحب کے افسانے عصری معنویت اساس ہیں اور آج بھی اپنا بھرپور ادبی جواز رکھتے ہیں۔

Yaron ka yaar,Umda nasr nigar Prof. Sagheer Afrahim by Shoaib Nizam Kanpur- cell-960416841

شعیب نظام (کانپور)

یاروں کا یار عمدہ نثر نگار پروفیسر صغیر افراہیم

خاکہ نگاری کے لیے بہت سیدھے اور اچھے انسان بہت مشکل ہوتے ہیں اس لیے ان پر خاکہ لکھنا سپاٹ بیانی کی طرف لے جاتا ہے مگر صغیر میں اتنی خوبیاں ہیں کہ ان پر خاکہ نہ لکھنا بھی خاکہ نگاری کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ تو آیئے ماضی کے در وا کرتے ہیں۔ صغیر افراہیم کا اصل نام محمد صغیر بیگ افراہیم ہے۔ ان کے والد محمد یعقوب بیگ متمول خاندان کے فرد تھے جن کا قیصر گنج بازار ،اناؤ میں ''فریسکو میڈیکل اسٹور'' تھا۔ صغیر افراہیم کے سرپرست سید محمد علی شاہ کا علمی خانوادہ تھا۔ صغیر ضلع اناؤ میں ۱۲/جولائی ۱۹۵۳ء کو اس جہانی فانی میں تشریف لائے۔ انٹرمیڈیٹ تک تعلیم انھوں نے اناؤ میں ہی حاصل کی ،اس کے بعد بی اے آنرز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے کیا اور ایم اے اردو میں وہ گولڈ میڈلسٹ تھے۔

انھوں نے ویمنس کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقریبا آٹھ سال پڑھایا۔ ۱۹۹۷ء میں ریڈر ہو کر آرٹس فیکلٹی کے شعبہ اردو میں آ گئے۔ اور ۲۰۰۵ء میں پروفیسر کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہو گئے۔ علی گڑھ میں ایم اے کے بعد انہیں یو جی سی سے اسکالر شپ ملتی تھی اور ریڈیو کے پروگراموں سے بھی رقم ملتی تھی، اس لیے تحقیقی مقالہ لکھنے کے دوران انھوں نے بہت شاندار زندگی گزاری جو عموماً طلبا کو نصیب نہیں ہوتی۔ اُن کی اہلیہ سیما کانپور میں ہی درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ صغیر افراہیم سے جب ان کی شادی ہو گئی تو پی ایچ ڈی کرنے کے بعد ان کا تقرر بھی شعبہ اردو علی گڑھ یونیورسٹی میں ہو گیا اور وہ ترقی کرتے کرتے پروفیسر کے عہدہ تک پہنچ گئیں۔

طالب علمی کے زمانہ سے ہی میری دوستی صغیر افراہیم، طارق چھتاری اور خورشید احمد (یہ سب بعد میں پروفیسر ہو گئے) سے تھی۔ صغیر افراہیم عام طالب علموں کے برعکس کسی طرح کی شرارت نہیں کرتے تھے اور نہ انہیں خوبصورت لڑکیوں کو دیکھنے کا شوق تھا، اس لیے میں انہیں بدذوق ہی کہتا

کہ ان کا اوڑھنا بچھونا پروفیسر شافع قدوائی کی طرح صرف کتابیں پڑھنا اور لکھنا تھا۔ ان دونوں کی ساری دلچسپی خوبصورت چہروں سے زیادہ بوسیدہ کتابوں کی طرف تھی۔ کتابیں پڑھنے کا شوق اور کچھ نہ کچھ قلم گھسیٹنے کی بیماری تو مجھے بھی تھی مگر میرا مزاج صغیر افراہیم سے خاص مختلف تھا۔ مجھے اچھے کھانے اور اچھی صورتیں ہمیشہ اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھیں مگر صغیر افراہیم کا وہی حال تھا کہ فلک جنبد نہ جنبد گل۔ محمد صغیر کی محبت میں سیما بھی بالکل صغیر کے نقش قدم پر چلنے لگیں اور وہ بھی پڑھنے اور لکھنے میں سارا وقت صرف کرنے لگیں۔ سیما نہایت خوش سلیقہ اور خوش اخلاق خاتون تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ان شوہر اور بیوی سے کس نے کس کا اثر قبول کیا۔ سیما کی بھی تواتر سے کتابیں شائع ہوتی رہیں۔ میں جب علی گڑھ جاتا تو شافع کے علاوہ سیما مجھے کھانے کی دعوت ضرور دیتیں اور شافع کی اہلیہ کی طرح وہ بھی بہت خوش ذائقہ کھانے پکاتی تھیں۔ صغیر افراہیم نوجوانی میں ہی بزرگوں جیسی گفتگو کرنے کے عادی تھے۔ میرا تو یہی خیال ہے کہ بچپن سے وہ سیدھے پختہ عمر میں داخل ہو گئے۔ سچ میں نوجوانی اور جوانی کب آئی اور کب گئی اس کا علم صغیر کو ہو تو ہو کم سے کم میں تو لاعلم ہی ہوں۔ صغیر اور سیما کو دیکھ کر مجھے کبھی یہ دونوں شوہر اور بیوی نہیں معلوم ہوئے، دونوں ایک دوسرے کے بہت پیارے دوست تھے اور ادبی موضوعات پر ایک دوسرے سے اختلاف بھی زور وشور سے کرتے تھے مگر تھوڑی دیر بعد کوئی نہ کوئی قائل ہو جاتا تھا پتہ نہیں یہ استدلالی معاملہ تھا یا محبت کا۔ یہ بھی میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔

میرا خیال ہے کہ صغیر افراہیم اپنے افسانوں، ترجموں، تحقیقی مقالوں، اداریوں کے لکھنے اور موٹی موٹی کتابوں کے پڑھنے میں ہی مصروف رہے اور انھوں نے آخری سانس تک سیما کو بھی اسی کا عادی بنا دیا تھا۔ یہاں پر علی گڑھ سے متعلق ایک لطیفہ میرے ذہن میں کلبلا رہا ہے جسے لکھنے سے میں اپنے آپ کو روک نہیں پا رہا ہوں۔ علی گڑھ میں ایک پُرانے طالب علم اپنے دوست کے ساتھ پُرانے دنوں کی یاد تازہ کرنے یونیورسٹی تشریف لائے۔ وہ دوست کو بتا رہے تھے کہ دیکھ لیجئے وہی تہذیبی ماحول وہی شیروانیاں وہی مہذب لہجہ، سامنے سے ایک لڑکی اور لڑکے کو آتے دیکھ کر انھوں نے کہا کہ وہی معاشقے، لڑکے نے جواب دیا کہ کیا بدتمیزی ہے یہ میری کزن ہے تو وہ صاحب بولے وہی بہانے۔ مگر اس طرح کے معاشقوں سے صغیر افراہیم اور میرے دوست شافع قدوائی کا کوئی علاقہ نہیں رہا، ان لوگوں کی زندگی میں سارا عشق کتابوں سے رہا۔

صغیر افراہیم کی طالب علمی کے زمانہ میں علی گڑھ یونیورسٹی کا کیا ماحول رہا ہوگا، اس کا

اندازہ پروفیسر صغیر افراہیم کے ہی ایک اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے جو انھوں نے اپنے دوست پروفیسر ابن کنول کے خاکہ ''خاص وضع قطع کا مخلص انسان'' میں اُبھارا ہے:

''اس شگفتہ مزاج شخص سے میرے مراسم ۱۹۷۵ء سے تھے۔ میں آفتاب ہال کے ممتاز ہوسٹل میں رہتا تھا۔ شام کو ٹہلتے ہوئے شمشاد مارکیٹ ضرور جاتا تھا۔ حبیب حال سے تصویر محل تک، انوپ شہر روڈ کے ڈیڑھ کلومیٹر کا یہ حصّہ شام کو طلبہ سے آباد رہتا۔ چاہے بُوم کلب کے متوالے ہوں یا سنڈے کلب کے دیوانے، کسی نہ کسی ڈھابے کی رونق میں اضافہ کرتے نظر آتے ---یہ ادب نواز طالب علم جن میں کچھ نیا کرنے اور ادبی اُفق پر چھا جانے کی لگن ---ان بھری پری اور رونق دار محفلوں کو چھوڑ کر، ابن کنول دہلی چلے گئے''۔

صغیر افراہیم کی طالب علمی کے دوران اُن کے گروپ میں طارق چھتاری، آشفتہ چنگیزی، ابوالکلام قاسمی، مہتاب حیدر نقوی، عقیل احمد، شارق ادیب، فرحت احساس، خورشید احمد، غضنفر، عبید صدیقی، اظہار ندیم، پیغام آفاقی، پرویز جعفری، اسعد بدایونی، شہپر رسول، قمرالہدیٰ فریدی، غیاث الرحمن، ابن کنول اور سید محمد اشرف شامل تھے۔ کینٹین سے اُٹھ کر یہ گروپ کبھی پروفیسر شہریار صاحب کے دولت کدے پر دھاوا مارتا اور کبھی پروفیسر قاضی عبدالستار کے دربار میں جا کر مؤدب بیٹھ جاتا۔ اس گروپ کے زیادہ تر افراد ادبی دنیا میں چاند ستاروں کی طرح اپنی چمک بکھیر رہے ہیں۔ کئی ستارے اب ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں مگر ان کی تخلیقات کی روشنی آج بھی طالب علموں اور ادب کے باذوق قارئین کو روشنی دکھاتی رہتی ہے۔ اس میں ابوالکلام قاسمی، عبید صدیقی، اسعد بدایونی، ابن کنول جیسے دوست گو اب اس دنیا میں نہیں ہیں مگر ان کی عادتیں اور ان کے ادبی کارنامے اب بھی اس طرح ذہن سے چمٹے ہوئے ہیں جنھیں اپنی ذات سے الگ کرنا اب ممکن نہیں رہا۔

صغیر افراہیم نے تنقید کے حوالہ سے جو اہم کارنامے انجام دیئے ہیں ان میں ''پریم چند-ایک نقیب''، اردو کا افسانوی ادب، اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل، نثری داستانوں کا سفر، اردو فکشن تنقید اور تجزیہ، افسانوی ادب کی نئی قرات، اردو افسانہ: تعریف، تاریخ اور تجزیہ، اردو ناول: تعریف، تاریخ اور تجزیہ'' اسی طرح شاعری میں ''ہم عصر اردو غزل، اردو شاعری تنقید اور تجزیہ، جگت موہن لال رواں (مونوگراف) اور ابھی ابھی واٹس اپ پر نظر پڑی تو معلوم ہوا کہ مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کیفی اعظمی پر صغیر افراہیم کے لکھے ہوئے مونوگراف کا رسم اجراء کرا رہی ہے۔ پریم چند کی تخلیقات کا معروضی مطالعہ، عصر حاضر میں علی گڑھ تحریک کی اہمیت و معنویت جیسی کتابیں منظر عام پر

آ چکی ہیں اور ادبی حلقوں میں خاصی مقبول رہی ہیں۔صغیر افراہیم نے تحقیق کے میدان میں بھی ہاتھ آزمائے ہیں اُن کی کتاب ''غالبؔ باندہ اور دیوان محمد علی'' غالبؔ کے غیر مطبوعہ خطوط اور ان کے سفر باندہ سے متعلق جو سفر کلکتہ کے بیچ کا پڑاؤ تھا جس خوبصورتی اور عرق ریزی سے تحقیق کی داد دی ہے اس کی داد انھیں ہندوستان اور دوسرے مما لک سے بھی ملی ہے۔

صغیر افراہیم افسانوی ادب میں ثابت قدمی کے ساتھ آگے بڑھے ہیں۔تخلیقی طور پر دیکھیں تو ان کا افسانوی مجموعہ ''کڑی دھوپ کا سفر'' اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں شائع ہو کر ادبی حلقہ میں خاصا مقبول ہوا ہے۔اور تنقید نگاری کی تخلیقی بصیرت کو منعکس کرتا ہے۔ ہمارے اِس دوست کے یہاں تخلیق اور تنقید کا امتزاج بھی کیا خوب ہے، پھر تحقیقی عمل نے مزید چار چاند لگا دیئے ہیں۔صغیر افراہیم کی فکشن پر بہت گہری نظر ہے، انھوں نے پریم چند کی تمام تخلیقات کا معروضی جائزہ لیا ہے۔اردو، ہندی کے ایک ایک افسانے کو پوری توجہ اور سنجیدگی سے فن کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ آنے والے افسانہ نگاروں کے لیے پریم چند نے ایسا مثبت نقطہ نظر پیش کیا ہے اور ایسا روشن بیانیہ خلق کیا ہے جس سے خاصے زمانے تک اردو افسانے پر، پریم چند کے اثرات برقرار رہیں گے۔ترقی پسند تحریک کا پہلا خطبہ ۱۹۳۶ء میں پریم چند نے پیش کیا تھا، ان کا یہ جملہ کہ اب ہمیں عشق کا معیار بدلنا ہوگا، اس نے پوری ترقی پسند تحریک پر گہرا اثر ڈالا اور اب مزدور اور پتھر توڑتی ہوئی محنت کش عورتیں اور کالو بھنگی جیسے کردار ہمارے سامنے آئے، اگر پریم چند نہیں ہوتے تو ترقی پسند تحریک کے زیر اثر، انسانی جذبہ سے مغلوب ہو کر انسانی ہمدردی کے پس منظر میں جو ادب تخلیق کیا گیا ہے شاید وہ ادب بہت آسانی سے تخلیق نہیں ہو پاتا۔ پریم چند کی اس خوبی کو نشان زد کرتے ہوئے پروفیسر صغیر افراہیم نے بجا طور پر انہیں ایک نقیب کا خطاب دیا ہے جو بالکل درست ہے۔ پریم چند شناسی میں صغیر افراہیم کا نام عزت سے لیا جاتا ہے، اور وہ بجا طور پر اس کے حقدار بھی ہیں۔

اُن کا دوسرا کارنامہ ''اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل'' یہ خاصا دلچسپ موضوع ہے اور یلدرم، چودھری محمد علی اور دیگر افسانہ نگاروں کو موضوع بنا کر انھوں نے پریم چند سے قبل اردو افسانے کی جو روایت تھی اسے نشان زد کرتے ہوئے راشدالخیری، عظیم بیگ چغتائی سدرشن، اعظم کریوی وغیرہ کی تحریروں سے سیر حاصل گفتگو کی ہے اور اس طرح اردو افسانے کے ابتدائی نقوش کو بہت کامیابی کے ساتھ منظر عام پر لے آئے ہیں۔ یہ ایک تحقیق طلب عمل تھا جہاں صغیر افراہیم خاصی کامیابی سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ان کا تیسرا کام ''نثری داستانوں کا سفر'' ہے۔اس موضوع پر بعد

میں شمس الرحمن فاروقی نے بے مثال کام کیا ہے لیکن صغیر افراہیم نے ہماری نثری داستانیں جنھیں نئی نسل فراموش کرتی جارہی تھی اسے پوری ذمہ داری اور ادبی دیانت داری کے ساتھ نئی نسل تک منتقل کر دیا ہے۔ یہ کام ظاہر ہے اتنا آسان نہیں ہے اس کے لیے داستان کی بہت سی جلد میں پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ مشکل اور محنت طلب کام صغیر افراہیم نے خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ اور بہتر نتائج برآمد کیے۔ اس پر ایک طالب علم پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کرسکتا تھا۔ جس میں کم سے کم تین سال لگتے ہیں مگر صغیر افراہیم نے اس بڑے پتھر کو صرف چوم کر چھوا نہیں بلکہ اسے اٹھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

''اردو کا افسانوی ادب: تحقیق اور تنقید'' یہ موضوع بھی خاصا پھیلا ہوا ہے اور اس میں صغیر افراہیم نے تحقیق سے بھی کام لیا ہے اور ان افسانوں کا تنقیدی جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ پریم چند سے لے کر منٹو، بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر اور پھر صغیر کے عہد کے افسانہ نگار اِس جہانِ افسانہ سے خود لطف اندوز ہونا اور ان کا تجزیہ پیش کرنا یہ بھی پی ایچ ڈی کی تحقیق کا موضوع ہے مگر صغیر افراہیم نے اس مشکل مرحلہ کو بھی سر کیا ہے۔ یہ کتاب بھی ادبی حلقوں میں خاصی پسند کی گئی، اور اس کے کئی ایڈیشن آچکے ہیں۔

''اردو ناول تعریف، تاریخ اور تجزیہ'' ان کی یہ کتاب بھی ہر لحاظ سے قابل ذکر ہے۔ ایم اے کے طالب علم اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ بھی اس کتاب سے مستفیض ہوتے نظر آئے خود مجھ سے ڈگری کالج کے کئی اساتذہ نے یہ کتاب منگوائی۔ ایم اے کے طالب علم چونکہ ان کے نصاب میں ناول کا بھی ایک پیپر ہوتا ہے اس لئے یہ کتاب ان کی ضرورت کی کتاب بن گئی ہے۔ جس طرح پروفیسر شارب ردولوی کی کتاب جدید اردو تنقید اصول ونظریات طالب علموں اور اساتذہ کی ضرورت بن گئی تھی اسی طرح یہ کتاب بھی ہے تبھی تو جلد جلد اس کے ایڈیشن شائع بھی ہوتے رہے ہیں۔ اور صغیر افراہیم کا نام مستقبل میں بھی روشن کرتے رہیں گے۔

ترتیب وتدوین کے میدان میں صغیر افراہیم نے خاصا کام کیا ہے۔ ان کے کارناموں میں متن کی قرأت، قرۃ العین حیدر نمبر، سعادت حسن منٹو (ایک صدی کے بعد)، اردو کے مختصر افسانے، حسین الحق کے نمائندہ افسانے۔ اور اطراف ظل الرحمن بھی بہت اہمیت کے حامل ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادب صغیر افراہیم کا اوڑھنا بچھونا رہا ہے۔ ادب نے ہی انہیں عشق کرنے کا موقع تک فراہم نہیں کیا مگر یہ ساری کمی شادی کے بعد انھوں نے سیما سے عشق کر کے پوری کردی۔

سیما اور صغیر دونوں اپنے طالب علموں میں بہت مقبول رہے اس لئے کہ دونوں ہونہار طالب علموں کی حوصلہ افزائی کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ میرے رابطہ میں ایسے بہت سے ریسرچ اسکالر آئے جنہوں نے سیما اور صغیر کی حوصلہ افزائی کے بہت سے قصہ سنائے۔ میرا جب علی گڑھ جانا ہوتا تھا تو سیما جو بھابھی سے زیادہ مجھے بہن لگتی تھیں اس نے ہمیشہ پسند کے کھانے تیار کر کے اور ضد کر کے مجھے اپنے گھر پر کھلایا ورنہ پروفیسر شافع قدوائی کی موجودگی میں مجھے اور کہیں جانے کا خیال بھی نہیں آتا ہے کیونکہ شافع میرے کلاس فیلو بھی ہیں مگر سیما جس محبت سے مجھے کھانے پر مدعو کرتی تھیں انکار کرنے کا حوصلہ بھی مجھ میں نہیں ہوتا تھا۔

میں نے جب لکھنو میں پروفیسر نیر مسعود پر ایک سیمینار کا انعقاد کیا تو پہلی فہرست میں صغیر تھے مگر سیما کا نام شامل نہیں تھا۔ سیما نے فون پر مجھ سے کہا کہ شعیب بھائی آپ کے پروگرام میں اگر میں نہیں آئی تو کیا آپ کو اچھا لگے گا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور میں نے سیما سے کہا کہ آپ ضرور آئیں مجھے بہت اچھا لگے گا۔ سیما آئیں اور سانس کی تکلیف کے باوجود بہترین مضمون پڑھا۔ ان کی تکلیف کا احساس شمس الرحمن فاروقی اور قاضی افضال حسین کو بھی ہو گیا۔ سیما کے انتقال (۲۸/مارچ ۲۰۲۲ء) کے بعد اب علی گڑھ میں ایک کمی محسوس ہوتی ہے اور اتنے بڑے گھر میں صغیر کو اکیلا دیکھ کر میرا دل کُڑھنے لگتا ہے مگر صغیر، سیما کی یاد میں انہیں کے نام سے رسالہ جاری کر کے دن رات اپنے کو مصروف رکھتے ہیں اور اس رسالہ کو خوب سے خوب تر بنانے میں اپنا سارا زور صرف کرتے رہتے ہیں۔ ادبی حلقوں میں یہ رسالہ خاصا مقبول ہو رہا ہے۔ ہر چند صغیر افراہیم جیسے شریف آدمی کو رسالہ سے مفاد نہیں ہو رہا ہے مگر عشق میں چاہے وہ ادب سے ہی کیوں نہ ہو نفع و ضرر کے پیمانے کون استعمال کرتا ہے۔

صغیر افراہیم کے کارناموں پر کئی کتابیں آچکی ہیں مگر دو بہت اہم کتابیں ''صغیر افراہیم کا تنقیدی شعور'' ڈاکٹر مظفر اقبال کی اہم کتاب کے ہے اور ''جہانِ صغیر افراہیم'' کے عنوان سے ڈاکٹر حنا آفرین نے ایک ضخیم کتاب جن کے صفحات تقریباً ہزار سے زیادہ ہوں گے تحریر کی ہے جس سے صغیر افراہیم کی تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی رویوں کے سمجھنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔ اس میں ان کے فن پر تفصیل سے سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے ہے کیونکہ صغیر افراہیم ہمہ جہت فنکار ہیں۔ تنقید کے علاوہ تحقیق اور افسانے جیسے مختلف موضوعات پر انہوں نے تقریباً تین سو مضامین لکھے ہیں جو ملک و بیرون ملک کے ادبی رسالوں میں تواتر سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ماضی کے علی گڑھ میں بڑی سرگرمیاں رہتی

تھیں۔اس زمانے میں فرحت احساس، سید محمد اشرف، طارق چھتاری، عقیل احمد، عبید صدیقی، آشفتہ چنگیزی، صغیر افراہیم تھے۔ وہ دو ایک سے تھوڑا جونیئر ضرور تھے اس لئے گروپ میں زیادہ مؤدب رہتے تھے۔علی گڑھ میں جونیئر اور سینئر کا بہت لحاظ رہتا ہے۔لیکن میں نے محسوس کیا کہ صغیر اپنے بہت چھوٹوں کے ساتھ بھی نہایت مہذب رہتے ہیں۔

میں اسعد بدایونی جو آفتاب ہال کے کمرہ نمبر ۲ میں رہتے تھے ان کے ساتھ رُکتا تھا وہ بھی اسی گروپ کے گویا رکن تھے،منظور ہاشمی اور شہپر رسول ان کے بے تکلف دوست تھے۔صغیر صاحب کی شرافت اور سادگی تب بھی اچھی لگتی تھی اب بھی اچھی لگتی ہے۔ اسعد بہت زود رنج واقع ہوئے تھے۔ان کی اکثر دوستوں سے لڑائی ہوتی رہتی تھی۔منظور ہاشمی سے جب وہ ناراض ہوتے تو انہیں منجورا کا خطاب دے دیتے پھر میرے دوست شافع قدوائی صاحب کا علی گڑھ میں ماس میڈیا میں تقرر ہو گیا اور میں ان کے کرائے کے گھر میں رکنے لگا۔اسعد بہت ناراض ہوتے تھے اور کہتے تھے یار تم اس مولوی سے کیا باتیں کرتے ہو، میں جواب دیتا کہ بھائی وہ یونیورسٹی سے میرے کلاس فیلو ہیں اس لیے موضوعات کی کمی کہیں ہو سکتی ہے دوسرے ادب تو دائمی موضوع ہے ہی۔اُس زمانے کے علی گڑھ کی صورت کچھ الگ تھی۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے ''وہ بھی کیا دن تھے'' کے عنوان سے، اپنے عہد کی جو منظر کشی کی ہے انھیں کی زبانی سنیے:

''۲۴ رمئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ میں مدرستہ العلوم قائم کیا گیا۔ٹھیک سو سال بعد، میں اُتر پردیش کے ضلع اناؤ سے انٹرمیڈیٹ کر کے یہاں بی۔اے (آنرز) کرنے آیا۔عموماً اُس زمانہ میں انٹر کے بعد طلباء دو سالہ کورس میں جبکہ پی۔یوسی کرنے والے تین سالہ کورس میں داخلہ لیتے تھے مگر اتفاق کہ آرٹس فیکلٹی کے ڈین آفس کے سینئر کلرک فصیح احمد صاحب نے میرے لوکل گارجین جناب سید وقار حسین کو مشورہ دیا کہ صغیر میاں کے لیے تین سالہ کورس بہتر رہے گا۔ داخلہ مکمل کرایا گیا۔ آفتاب ہال الاٹ ہوا۔اگلے دن ممتاز ہاؤس کے کمرہ نمبر ۲۴ میں سامان کے ساتھ پہنچ گیا۔میرے سینئر بیک روم پارٹنر پرتاپ گڑھ کے کبیر احمد صاحب تھے۔فرنٹ روم میں میرے ساتھ ایم بی بی ایس سال اول کے طالبعلم کشوری لعل تھے۔ پنجاب کا یہ بانکا جوان کمرے میں بہت کم رہتا تھا۔ کشوری لعل کے علاوہ خادم رضا جاوید، کامران اور عتیق احمد تھے۔ چند ماہ بعد مسجد سے ملحق کمرہ نمبر ۳۸ میں آ گیا۔وہاں میرے دونوں سینئیر رفیق احمد اور سراج الدین انجینئر نگ کے طالبعلم تھے۔

ممتاز ہوسٹل ادبی سرگرمیوں کے لحاظ سے ہمیشہ ممتاز رہا ہے۔اُس عہد میں اس عالیشان

عمارت کی تینوں وینگس میں الگ الگ ہا چل رہا کرتی تھی اور کیمپس میں یہ تین مختلف صفات سے جانی جاتی تھیں جیسے پہلی ونگ جو روم نمبر ایک سے روم نمبر ۱۷ ر پر مشتمل تھی، بگڑی ہوئی مگر ادبی ونگ کہلاتی تھی۔ چھوٹے قد کے وصی صاحب، دراز قد آفتاب صاحب کی دادا گیری اور شاہد بوس کی مصلحت اندیشی کی وجہ سے یہ ونگ سرخیوں میں رہتی تھی حالانکہ یہ ونگ ادبی سرگرمیوں کے لیے بھی مشہور تھی۔ ڈراما کلب کے انیس صاحب جن کے مکالموں کی ادائیگی کی گونج تھی، علی سردار جعفری کے بھتیجے پرویز جعفری جن کے اشعار کیمپس سے باہر بھی ذوق وشوق سے پڑھے جاتے تھے۔ کفیل احمد صدیقی جو سائنس کے طالب علم تھے مگر بلا کا ادبی ذوق رکھتے تھے۔ اُن میں یہ بھی صلاحیت تھی کہ روم پارٹنر پرویز جعفری جو اشعار کمرے میں ٹہل ٹہل کر کہتے یا گنگناتے وہ اُن کے حافظے میں محفوظ ہو جاتے اور پھر بیت بازی میں کفیل صاحب بازی مار لے جاتے۔ ان کے علاوہ طارق چھتاری بھی اسی رنگ میں رہتے تھے۔ ممتاز ہوسٹل کی دوسری ونگ (روم نمبر ۱۸ سے روم نمبر ۲۹ تک) کھانے پینے اور مست رہنے والوں کی کہلاتی تھی۔ ڈائننگ ہال اس کے بیچوں بیچ میں واقع تھا اور تبلیغی جماعت کا اثر بھی اسی حصہ پر نظر آتا تھا۔ سید امتیاز احمد، سراج الحق، شہاب الدین اور شریف بھائی کے علاوہ علی الصباح جاگنے والے طلباء برآمدے کی سیڑھیوں یا آراستہ لان میں بآواز بلند الگ الگ لحن میں قرأت کرتے نظر آتے تھے۔

تیسری ونگ جس میں راقم الحروف رہتا تھا، انجینئرس ونگ کہلاتی تھی کیونکہ انجینیر نگ کے بیشتر طلباء اسی میں رہتے تھے۔ عمارت کا یہ مشرقی حصہ دیر رات تک جاگتا رہتا تھا حالانکہ میں عام طور سے گیارہ بجے تک سو جایا کرتا اور صبح پانچ بجے اُٹھ جانا معمول بن گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رفیق صاحب اور سراج صاحب دس بجے کے بعد ہی پڑھنے کی میز پر بیٹھا کرتے تھے۔ اُن کے دوست جن میں میرے ہم وطن نُصرت کرمانی صاحب بھی شامل تھے، رات گئے آتے۔ گھنٹوں subject یا پھر کسی بھی موضوع پر گفتگو ہوتی۔ رفیق پر صاحب خود چائے بناتے۔ کمرے میں یا باہر برآمدے کی سیڑھیوں پر چائے پی جاتی مگر یہ سب کچھ اس آہستگی ہے کہ میری نیند میں کوئی خلل نہیں پڑتا۔ ٹیبل لیمپس کے زاویے بھی وہ اس طرح رکھتے کہ براہ راست اُس کا عکس میری مچھردانی پر نہیں پڑتا۔

تقریباً پچیس سال بعد (۲۰۰۲ء) جب میں سر ضیاء الدین ہال کا پرووسٹ ہوا تو لگا ہوسٹل کی زندگی بہت کچھ بدل چکی ہے۔ خطوط، منی آڈر یا پوسٹ مین ہی زندگی سے بے دخل نہیں ہوا، طلباء کے معمولات اور سوچ میں بھی تبدیلی آ چکی تھی۔ اسے مثبت کہیں یا منفی! ضرورت کی مادی اشیاء

میں شرکت سے گُریز۔نفسانفسی کا بڑھتا رُجحان۔ والدین یا سرپرستوں کی آمد پر پاس پڑوس کے دوستوں میں گرمجوشی کا فقدان۔نہ دوسروں کا دل سے لحاظ واحترام اور نہ ہی قوت برداشت، ذمہ دار کون!!! بدلتے افکار،نظریات اور رُجحانات؟ اساتذہ طلباء انتظامیہ؟ یا پھر ہم سب، ہماری بڑھتی ہوئی آرزوئیں اور بہت جلد بہت کچھ پالینے کی ہوس!

مجھے یاد ہے کہ میرے بیشتر seniors خدمت گار (Bearer) سے کبھی بھی سخت لہجے میں گفتگو نہیں کرتے تھے بلکہ سلام میں سبقت حاصل کرتے تھے۔شمس الدین میاں، علاءالدین میاں، ادریس میاں یا نصیر میاں، بھی سب کا بیحد خیال رکھتے تھے۔ میری وِنگ کے پرویز احمد صاحب جو رامپور کے رہنے والے تھے اور سول انجینئرنگ کے طالبعلم تھے، انہیں شہاب الدین صاحب اس بات پر ٹوکتے تھے، کہ وہ علاءالدین میاں کو علاءالدین کہہ کر پکارتے تھے۔حالانکہ جمیل صاحب جو سنبھل کے رہنے والے تھے، بہت سنیئیر اور غصہ ور تھے۔وہ رات میں Gatekeeper کو اُس کے نام اللہ رکھا سے ہی با آواز بلند مخاطب کرتے تھے اور وہ بھی خوشی خوشی اُن کے کمرے میں بیٹھا چائے بناتا، پیتا اور پلاتا رہتا یا پھر اُن کے اور اُن کے احباب کے لئے چھوٹے دروازے سے (جو، اب بند ہوگیا ہے) جسے اُس زمانے میں چور دروازہ کہا جاتا تھا، شمشاد مارکیٹ سامان لینے چلا جاتا۔ اللہ رکھا کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ تہجد پڑھتا ہے۔مسجد میں رات بھر عبادت کرتا ہے حالانکہ ہمارے سائڈ روم پارٹنر عتیق احمد صاحب جو موذن کے جاگنے سے قبل فجر کی اذان دے دیا کرتے تھے، اُن کے مطابق اللہ رکھا مسجد میں اطمینان سے سوتا رہتا تھا''۔

(آزادی کے بعد علی گڑھ کے دانشور کی سوچ، اپنی خودنوشت سوانح کے آئینہ میں، مرتبہ ڈاکٹر شائستہ خاں، ۲۰۱۳ء] ڈائریکٹر خدابخش لائبریری پٹنہ])

یہ اقتباس کہ یہاں کھلی فضا تھی، اور کشادہ ماحول، مذکورہ باتوں کا غماز ہے۔ چلیے حال کی لٹریری سوسائٹی سے نکل کر کر یونیورسٹی کے مرکزی لٹریری کلب کی طرف کوچ کیا جاتا جہاں سکریٹری کے حیثیت سے سید محمد اشرف موجود ہوتے۔ سید محمد اشرف سب سے زیادہ ادبی سرگرمیوں میں فعال نظر آتے۔علی گڑھ ایک بڑا ادبی مرکز تھا۔ رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، خورشید الاسلام، پروفیسر مسعود حسین خاں، معین احسن جذبی، اختر انصاری، خلیل الرحمن اعظمی، قاضی عبدالستار، شہریار، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، سید امین اشرف، وارث کرمانی، صلاح الدین پرویز اور منظور ہاشمی وغیرہ یہیں مقیم تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اُس زمانہ میں عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، علی سردار جعفری، جاں نثار

اختر، شمس الرحمن فاروقی، گوپی چند نارنگ، اختر الایمان اور محمود ہاشمی وغیرہ اکثر علی گڑھ آتے اور یہ گروپ یونیورسٹی کی کسی انجمن یا کسی بزرگ ادیب کے گھر پر اُن کا کلام سنتے اُن سے گفتگو کرتے اور اپنی تخلیقات سناتے، اِس گروپ میں صغیر افراہیم بھی شامل ہوتے تھے۔

علی گڑھ میں طالب علم زندگی کے ہر مرحلے کو مل جل کر طے کرتے ہیں اسی لئے یہاں ڈائننگ ہال میں کھانا کھانے اور شمشاد مارکیٹ میں چائے پینے یا تصویر محل میں فلم دیکھنے کوئی اکیلا نہیں جاتا گویا ایک اجتماعی زندگی کی داغ بیل پڑ جاتی ہے۔کھانے پینے کے آداب اور تکلفات بھی علی گڑھ کی خاص دین ہیں۔ چائے کے کپ میں چمچہ اتنا آہستہ چلاؤ کہ کھنکھناہٹ نہ ہو، منہ کے نوالے کی آواز برابر بیٹھے شخص تک نہ پہنچ جائے۔ چائے کی چسکی چسکی ہی لگے حقہ کی گڑگڑاہٹ نہیں، آہستہ چلئے، آہستہ بولئے، اُنگلی اُٹھا کر کوئی اشارہ مت کیجئے وغیرہ وغیرہ۔ یہ پابندیاں شروع میں نئے طالب علم کو بھلے ہی سخت اور بیجا لگتی ہوں لیکن کچھ دنوں بعد اس کی شخصیت کا حصہ بن جاتی تھیں۔اس وقت چائے خانوں کو ڈھابہ نہیں کہا جاتا تھا اور ان کے سامنے کھلے میں بیٹھ کر چائے پینے کا رواج نہیں تھا ہر چائے خانہ کے سامنے خوبصورت پردوں کی قناتیں لگا دی جاتی تھیں، پردے کے اندر کرسیاں لگی ہوتیں اور دھیمی آواز میں ریکارڈ پلیئر بج رہا رہا ہوتا ہوتا۔۔بیگم اختر، مہدی حسن اور غلام علی کی غزلوں کے سُر گونج رہے ہوتے، چائے پیتے وقت گپ بازیاں ہوتیں۔ یونیورسٹی کے مسائل پر گفتگو ہوتی، ادبی بحثیں ہوتیں اور میدان عشق کی فتوحات بیان کی جاتیں۔اس طرح بیٹھنا کہ سڑک سے گذرنے والے کی نظر چائے پیتے طالب علم پر پڑ جائے علی گڑھ کی سب سے معیوب بات تھی یعنی نمائش انداز کے بجائے خود کو چُھپا کر حُسن پیدا کرنا یہاں کا وصف تھا۔ یہ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۵ء تک علی گڑھ کا ذکر ہو رہا ہے جس میں صغیر افراہیم ضرور شامل رہتے۔ان کے مزاج میں یہ خوبیاں آج بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔علی گڑھ کے طالب علموں کو شاید کہیں اپنا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ان کے اطوار بتا دیتے ہیں کہ وہ علی گڑھ کے پروردہ ہیں۔

صغیر افراہیم نے اصناف نثر اور نظم میں بہت کچھ لکھا ہے۔ان کا مطالعہ خاصا وسیع ہے، طبیعت میں علی گڑھ والا انکسار طالب علمی کے زمانہ سے سبکدوشی کے بعد اب تک قائم ہے۔سیما اور صغیر دونوں پروفیسروں میں یہ انکسار اور ادب نوازی میں نے ہمیشہ محسوس کی ہے۔سیما کو بھی لکھنے پڑھنے کی لت سی لگ گئی تھی۔آنکھ اور تنفس کی مریضہ ہونے کے باوجود وہ لکھنے پڑھنے سے کبھی باز نہیں آئیں اس لئے ان کی درجن بھر سے زیادہ عمدہ کتابیں منظر عام پر آ کر سنجیدہ ادبی حلقوں سے داد و

تحسین وصول کر چکی ہیں۔ ایسے اچھے لوگ جسمانی طور پر ہم سب کی طرح مٹی کے حوالے ہو جاتے ہیں گر اُن کی تخلیقات کی خوشبو ایک زمانہ کو معطر کرتی رہتی ہے۔

صغیر افراہیم کو اتر پردیش اردو اکاڈمی سے لے کر مغربی بنگال اور بہار اردو اکادمیوں سے ان کی مختلف کتابوں اور دیگر ملک و بیرون ملک سے ادبی خدمات پر برابر انعامات واعزازات ملتے رہے ہیں۔ وہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے مذاکروں اور افسانوں کی نشست میں پابندی سے شرکت کرتے رہے ہیں۔ کسی بھی موضوع پر بے تکان گفتگو کر سکتے ہیں۔ عام طور پر ان کی گفتگو مدلل ہوتی ہے۔ وہ ملک کی مختلف ادبی تنظیموں کے سرگرم رکن رہے ہیں بلکہ آج بھی ہیں، اور ان تنظیموں کے ذریعہ مسلسل بہترین ادبی پروگرام منعقد کرتے ہیں۔ ایسے دو چار پروگراموں میں میں بھی شریک ہو چکا ہوں اور ان کی علمی و انتظامی صلاحیت کا قائل بھی ہوتا رہا ہوں۔

صغیر افراہیم صحافت کی دنیا کا بھی ایک جانا پہچانا نام ہے۔ وہ ایک زمانہ تک آرٹس فیکلٹی کے جریدہ ''دانش'' اور سرسید کے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کی ادارت کرتے رہے ہیں اور ملک و بیرون ملک سے قلمی تعاون اپنے ذاتی مراسم کے بنیاد پر حاصل کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے ماہنامہ تہذیب الاخلاق کے کئی خصوصی نمبر بھی نکالے جو معرکہ کی چیز ہیں اور سرسید نیز علی گڑھ تحریک کو سمجھنے میں بڑی حد تک معاون بھی۔ سرسید پر شافع قدوائی نے انگریزی زبان میں ایک بہت وقیع کام کیا ہے یہ کتاب اب اردو میں بھی دستیاب ہے جس میں حالی کی سرسید پر لکھی گئی بنیادی کتاب جاوید نامہ سے شافع نے خاصی جگہ اختلاف کیا ہے اور اپنی بات مستند حوالوں کے ذریعہ ثابت کی ہے۔ تہذیب الاخلاق میں صغیر افراہیم کے اصرار پر شافع قدوائی نے بہت سے مضامین لکھے ہیں۔

سیما کے انتقال (۲۸ /مارچ ۲۰۲۲ء) کے بعد کچھ دنوں تک تو صغیر بہت اکیلے اور اس صدمہ میں ڈوبے رہے مگر پھر انہوں نے اپنی ہمت یکجا کی اور سیما کے نام سے ہی ایک ادبی مرکز ''خیابانِ ادب'' کے نام سے قائم کیا، اور ''سیما'' مجلہ بھی شائع کرنا شروع کر دیا جو سہ ماہی ہے اور اپنے معیار اور اداریہ کی وجہ سے اردو دنیا میں خاصا مقبول ہو چکا ہے۔ اس بار ''سیما'' میں صغیر نے حضرت آوارہ پر شاندار گوشہ نکالا ہے۔ حضرت آوارہ اردو کے بلند پایہ ادیب اور بے بدل نثر نگار ہیں مگر ہم اردو والے اپنے محسنوں کو فراموش کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ صغیر افراہیم مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اردو کے اس صاحب طرز نثر نگار سے نئی نسل کو واقف کرایا۔ اب صاحب طرز بھی اس بے دردی سے استعمال ہونے لگا ہے کہ ڈر لگا رہتا ہے کہ بات دوسروں تک اس طرح

منتقل بھی ہورہی ہے یا تعمیم زدگی کا شکار۔ بہر حال یہ ایک شاندار کوشش ہے جس کی ستائش کی ہی جانی چاہئے۔ اصل میں سید محمد اشرف صاحب سے اُن کے مراسم بہت پُرانے اور گہرے ہیں ورنہ اتنا وقیع گوشہ کسی بھی رسالے کے لئے آسان نہیں تھا بغیر اشرف صاحب کے تعاون کے۔

صغیر صاحب اناؤ سے علی گڑھ جانے کے بعد پوری طرح سے وہاں کے ماحول کے عادی ہو گئے ہیں۔ یہ سرزمین ہی ایسی ہے جو پاؤں پکڑ لیتی ہے اور وہاں ملازمت پوری کرنے کے بعد کوئی واپس نہیں آنا چاہتا۔ صغیر افراہیم نے بھی ایک عالی شان گھر ''گُلِ افراہیم'' بنالیا ہے اور سیما کی یادوں کو ادب کی پرورش کی اوٹ میں چھپانے کی اپنی حدتیک کوشش کرتے رہتے ہیں مگر جس دکھ کا وہ اظہار نہیں کرتے وہ اتنا گہرا ہے کہ شاید اظہار کا محتاج بھی نہیں ہے۔ گزشتہ سال میں نے ناول پر ادارۂ البرکات میں ایک کل ہند سیمینار کا انعقاد کیا تھا۔ سید محمد اشرف صاحب کی سرپرستی اور تعاون کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا۔ اس سمینار میں شافع قدوائی، طارق چھتاری، صغیر افراہیم، غضنفر اور خورشید صاحبان نے ہر طرح سے تعاون پیش کیا، جس سے یہ ایک یادگار سمینار بن سکا۔

نصف صدی کے اِس منظر نامہ کے بہت سے در ہیں۔ صغیر افراہیم بحیثیت مترجم۔ ہندی کے علاوہ انھوں نے انگریزی سے سائنسی مضامین کا ترجمہ کیا اور اُنھیں برسوں پہلے، تہذیب الاخلاق میں برابر شائع کراتے رہے۔ وہ جنوادی لیکھک سنگھ کے جوائنٹ سکریٹری اور کارگزار صدر بھی رہے کیوں کہ ہندی ادب سے بھی اُن کا گہرا شغف رہا ہے۔ تقریباً تین دہائی قبل پروفیسر عبدالرحیم قدوائی نے اُن کی تنظیمی صلاحیتوں کے پیش نظر یو۔ جی۔ سی۔ اکیڈمک اسٹاف کالج کے ریفریشر کورس کا کوآرڈینیٹر مقرر کیا۔ اردو، عربی، فارسی، اسلامیات، دینیات ہی نہیں، اُن کے سپرد میڈیکل اور انجینئرنگ کے بھی کورسیز کیے گئے۔ اور انھوں نے اس کے ہر مرحلہ کو خوبی اور یکسوئی سے انجام دیا کہ انھیں یہ ذمہ داری آج بھی اُن کے سپرد کر دی جاتی ہے اور وہ اکہتر ۷۱ برس کے ہونے کے باوجود منع نہیں کر پاتے ہیں۔ ''انکار'' سے ناواقف ہونے کی بنا پر ہی پروفیسر سید محمد امین میاں نے ان کو ''پروفیسر مچان'' کہا، اس ٹائٹل پر کبیدہ خاطر ہونے کے بجائے صغیر افراہیم ہمیشہ مُسکرا کر رہ جاتے ہیں۔ صغیر صاحب اتنے شریف اور نفیس انسان ہیں کہ وہ کسی بات سے انکار نہیں کر پاتے۔ اگر آپ اُن سے کسی ستارے کی فرمائش کریں تب بھی اُن کا جواب یہی ہوگا کہ شعیب بھائی ایک ہفتے میں مل جائے گا۔ اب ایسے نیک اور شریف لوگ نایاب ہوتے جا رہے ہیں۔ اسی لیے صغیر صاحب مجھے اپنی اِس کمی کی باوجود بہت اچھے لگتے ہیں یا یوں کہیے کہ وہ ہیں ہی بہت اچھے۔ ☆☆☆

saher angez afsano ka khaliq : nayyar masood by Dr. Masihuzzama Ansari(Dept. of Urdu-Persian, school of languages,gujrrat university Ahmedabad) cell-9558931762

ڈاکٹر مسیح الزماں انصاری (اسسٹنٹ پروفیسر،شعبۂ اردو، فارسی گجرات یونیورسٹی،احمدآباد)

سحر انگیز افسانوں کا خالق : نیر مسعود

پروفیسر نیر مسعود کا شمار اردو افسانہ نگاری میں ایک معتبر افسانہ نگار کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ان کی پیدائش 1936ء میں ادبستان لکھنؤ میں ہوئی۔والد کا نام مسعود حسن رضوی ادیب تھا، جو کہ ادبی اعتبار سے بلند مرتبے کے حامی شخص تھے۔نیر مسعود کی ابتدائی تعلیم والد کے زیر سایہ گھر پر ہی ہوئی۔کیوں کہ ان کا گھر ایک علم کا گہوارہ تھا، جہاں نہ جانے کتنے تشنگان علم سیرابی حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ ادبستان کے در و دیوار سے ادبی جل ترنگ کے مانند کانوں سے صدائیں ٹکراتی ہوئی محسوس ہوتی تھی ،اور اطراف و جوانب کے ماحول میں بھی ادبی ترشح ،اور علمی نغمگی کے گمان کا اندازہ ہوتا ہے۔یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جہاں ادبی میلانات واحساسات اپنی ارتقائی منازل کی جانب رواں دواں ہونے کے بعد ڈیرے ڈال دیتے ہیں ،اس جگہ سے نیر مسعود کے قلم میں جنبش ہوتی ہے ،اور افسانوی شکل میں جدید گلکاریاں اور نایاب گوہر بار منظر عام پر نظر آتے ہیں۔

نیر مسعود اس شخصیت کا نام ہے جس کے قلم کی نوک سے لکھنوی تہذیب وتمدن ،تاریخی واقعات کی منظر کشی ،تنقید وتبصرے اور تراجم کے ساتھ ساتھ تحقیقی بلند آگہی کے موتی بکھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔علاوہ ازیں ان کے ذریعے قرطاس ابیض پر افسانوں میں سحر انگیزی کی وہ تمثیل پیش ہوتی ہے جو قارئین سے ان کی رفعت وعظمت کا تقاضا کرتی ہے۔یہ بات بھی قابل غور ہے کہ نیر مسعود صرف ایک محقق و دانشور ہی نہیں ، بلکہ اخلاقی پیکر کے حامل انسان تھے۔یہی وجہ تھی کہ بامِ شہرت پر فائز ہونے کے باوجود ہر ایک انسان سے بہت ہی بے باکی اور نرم گفتاری کے ساتھ پیش آتے تھے۔جس کی وجہ سے ان کو ادبی حلقوں میں احترام کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔

نیر مسعود کے افسانوں میں اس طرح کی سحر انگیزی اور جادوئی قدرت کا احساس ہوتا ہے کہ افسانہ طویل ہو یا مختصر، قاری سے یہی تقاضا کرتا ہے کہ اس کی قرأت مکمل کیے بغیر نہ چھوڑا جائے۔ دوران قرأت اگر قاری ان کو درمیان میں چھوڑنا بھی چاہے تو اس کے ذہن پر ایسے سحری نقش مرتسم ہوجاتے ہیں کہ اس کو ختم کئے بنا اس کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتے۔ وہ اپنے قاری کو تخیلات کی ایسی وادیوں کی سیر کراتے ہیں جہاں سے اس کی واپسی مشکل ہی نہیں، بلکہ ناممکن معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ نیر مسعود کے اسلوب وزبان اور انداز بیان پر جس فلسفی انداز کا غلبہ پایا جاتا ہے وہ اُن قارئین کو الطاف کے پرفضا اور شاداب نخلستان کی سیر کراتا ہے جو اپنے اندر ادبی اور ذہنی شعور رکھتے ہیں۔

نیر مسعود کے افسانوں میں حواس خمسہ کو متاثر کرنے والے، جوش و ولولہ اور شعوری میلانات میں طوفان برپا کردینے والے ایسے انسانی کردار پیش ہوتے ہیں جوان کو نابغہ روزگار افسانہ نگار کی حیثیت سے متعارف کراتے ہے۔ ان کے افسانوں میں جو کردار ابھر کر سامنے آتے ہیں وہ موقع ومحل کے اعتبار سے اچھوتے اسلوب میں پیش ہوتے ہیں اور پڑھنے والے کو ایسا محظوظ کرتے ہیں کہ وہ سدھ بدھ کھوکر اور شعور وجذبات سے ناآشنا ہوکر ان کے ساتھ قلمی منزل کی طرف رواں دواں ہوجاتا ہے اور ورق درورق اس سفر میں ان کا ہمرکاب نظر آتا ہے اور یہ بات ان کے افسانوں میں سحر انگیزی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اپنے افسانوں میں وہ ایسے دلکش کردار پیش کرتے ہیں کہ قاری کے احساسات وجذبات میں عجیب طرح کی اضطرابی کیفیت پیدا کردیتے ہیں اور قاری سرور و لطف کی حسین وادیوں میں سیر کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

نیر مسعود کے اکثر افسانوں میں جدید طرح کے المیاتی اور ڈرامائی عنصر کا غلبہ بھی پایا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے قاری کے قلب وجگر میں ایک ہوک سی اٹھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، اور اس کا دل ایثار و ہمدردی کے جذبے سے سرشار ہوا ٹھتا ہے۔ یہ ایسی سحر زدہ کیفیت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کو ہم ''پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر'' کے مصداق تسلیم کرسکتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں تمام واقعات ایسے ہی اسلوب میں بیان کیے جاتے ہیں کہ جہاں شفقت و مہربانی کے ساتھ ساتھ یاس وحسرت اور شرمندگی کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک افسانہ نگار کے اوپر یہ ذمے داری بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ ذخیرۂ الفاظ کو ایسے قرینے سے سجانے کی کوشش کرے کہ ان میں مفہوم و معنی اور صوتی اسلوب سے بھی تاثر پیدا ہو۔

ایک اچھے افسانہ نگار کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ ماحول سے متاثر ہوکر افسانہ تخلیق کرتا

ہے،مگر وہ کبھی کبھی ماحول کونظر انداز کر کے بیگانگی کی وادیٔ نمناک میں قدم رنجہ فرما تا ہے اوراس کے بعد خود ہی لطف وسرور اور وارفتگی کا باب وا ہوجا تا ہے۔اسی طرح اس کے نوکِ قلم سے حالت بے خودی میں وہ اسرار و رموز کھلنے شروع ہوجاتے ہیں جس کی زد سے نہ صرف فلسفہ، بلکہ قدیم اقدار وروایات، لایعنی طور وطریق، سماجی اور معاشی کوائف، اس کے علاوہ ظلم وتشدد اور رومانیت کے ساتھ ساتھ وہ تمام واقعات وحادثات آجاتے ہیں جو ایک سماج ومعاشرے کی ضرورت ہوتے ہیں۔ایک معتبر افسانہ نگار کا یہ خاصہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اوقات وزمانے کی سرحدوں کی حدود کو پار کر کے اپنی کمند ڈالیں، اوراس کے گرد آلود مطلع کو صاف کرنے کا ذمہ بھی اٹھائے۔یہ کام وہ ایک ماہر جادوگر یا ساحر کی طرح کرتا ہے۔ان تمام کاموں کو وہ اس انداز واسلوب کے ساتھ کرتا ہے کہ دیکھنے والے عش عش کر اٹھتے ہیں اوراس سے تاثر بھی قبول کرتے ہیں۔ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے پروفیسر نیر مسعود کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان میں تمام خوبیاں پائی جاتی تھیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ان کے افسانوں میں جہاں رومانیت اور جذباتیت کا مظاہرہ ہوتا ہے وہی انسانی ہمدردی، اور سادگی کا عنصر بھی نظر آتا ہے۔وہ اپنے افسانوں میں جہاں ایک ماہر جادوگر کی طرح خوف وواہمہ اور دہشت کا ماحول پیدا کرتے ہیں وہی سادگی اور مجبوری کا استعارہ بھی پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔جس کی مثال ہمیں افسانہ نصرت میں دیکھنے کو ملتی ہے۔کہ کس طرح وہ لاچار ومجبور عورت کے پاؤں کے گاڑی کے نیچے کچلنے کا واقعہ پیش کرتے ہیں۔

''نصرت مگر کیا ہوا تھا؟''

''اس پر اس نے مجھے پورا قصہ سنایا، جس کے بعض حصے میں بھول چکا ہوں، اور بعض حصے میں سن نہیں سکا، اس لیے کہ بیچ بیچ میں نصرت کی آواز ڈوب جاتی تھی۔شاید اسے تکلیف زیادہ تھی۔اس نے کچھ لوگوں کا ذکر کیا تھا جو ایک گاڑی پر سوار تھے اور انھیں کہیں جانے کی جلدی تھی۔شاید کوئی حادثہ ہوا تھا۔گاڑی کے سامنے کوئی رکاوٹ تھی جس کو ہٹانا ضروری تھا۔نصرت نے وہ رکاوٹ ہٹادی۔لیکن اس سے پہلے کہ وہ خود بھی ہٹتی، گاڑی چل پڑی جس سے نصرت کے دونوں پیر کچل گئے۔گاڑی رُکے بغیر نکل گئی اور نصرت دیر تک وہیں پڑی رہی۔''

''کیسے لوگ تھے۔''میں نے قصہ سن کر کہا،''ان کو پتا بھی نہیں چلا کہ انہوں نے تم کو کچل دیا ہے۔''

(افسانہ نصرت۔سیمیا۔نیر مسعود۔ص ۴۹۔۴۸۔1984۔نشاط پریس ٹانڈہ)

ان تمام باتوں کا تذکرہ کرنے کے بعد نیر مسعود نے ''نصرت'' کی سادگی کو کچھ اس انداز

میں پیش کیا ہے۔
''نہیں! انہیں معلوم ہو گیا تھا،'' نصرت نے کہا''۔اس لیے میرے پیر صرف اگلے پہیّے سے کچلے۔اس کے بعد ہی انہوں نے گاڑی کو اس طرح موڑ نکالا کہ پچھلا پہیّا میرے پیروں پر سے نہیں گذرنے پایا۔''
''مگر وہ رکے نہیں''۔
''انھیں جلدی تھی''(افسانہ نصرت۔سیمیا۔نیر مسعود۔ص ۴۹۔۴۸۔1984۔نشاط پریس ٹانڈہ)

افسانہ ''نصرت'' تقریباً ۱۹ صفحات پر مشتمل ایک طویل افسانہ ہے، اور افسانوی مجموعے سیمیا کا دوسرا افسانہ ہے۔اس افسانہ کو نیر مسعود کا ابتدائی افسانہ تسلیم کیا جاتا ہے۔جس میں ندرت بیان کی بیش بہا مثال پیش ہوتی ہے۔اس کے علاوہ نیر مسعود نے اس افسانے میں عورت اور معاشرے کی ستم ظریفیوں کے ساتھ اس کے ساتھ ایثار و ہمدردی اور محبت کا برملا اظہار بھی کیا ہے۔ایسے ہی افسانہ نصرت میں انھوں نے ایک بدکار عورت کا قصہ بھی بیان کیا ہے جس سے افسانے کی ابتدا ہوتی ہے۔ جو کہ مندرجہ ذیل ہے۔

''بدکار عورت کا قصہ مجھے اب یاد نہیں، لیکن اس وقت مجھے اس میں بڑی دلچسپی تھی۔اس لیے جب مجھ کو معلوم ہوا کہ اس کا قضیہ ہمارے یہاں پیش ہوگا اور وہ فیصلے کے لیے ہمارے گھر آئے گی تو میں بہت خوش ہوا۔اس سے پہلے بھی ایک مشہور بدکار عورت کا قضیہ ہمارے گھر میں پیش ہو چکا تھا اور میرے بزرگوں نے اسے بہت خوبی سے طے کر دیا تھا لیکن وہ میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے کی بات تھی۔''(افسانہ نصرت۔سیمیا۔نیر مسعود۔ص ۴۳۔1984۔نشاط پریس ٹانڈہ)

محولہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وقت کا دھارا ایک بہتے دریا کی مانند رواں دواں بہت دور نکل جاتا ہے مگر ایک افسانہ نگار ہے کہ ماضی و حال کے قلابے ملانے کے لیے بیتاب رہتا ہے۔اور اس کام کو وہ ایک ماہر جادوگر کی طرح بخوبی انجام دے لیتا ہے۔اس کے علاوہ اس افسانے میں نیر مسعود نے اور بہت سی باتوں کا تذکرہ پیش کیا ہے۔جو تمام کا تمام بدکار عورت اور نصرت کے اردگرد ہی طواف کرتا ہوا نظر آتا ہے۔مطلب یہ کہ نصرت کے پیروں کا گاڑی سے کچلنا، اور اس کا معصومیت سے یہ جواب دینا کہ نہیں انھیں جلدی تھی، اور اس کے پچھلے پہیے میرے پیروں سے نہیں گذرے، صرف اگلے پہیوں سے میرے پیر زخمی ہوئے ہیں۔اس کے علاوہ بوڑھے جراح کا نصرت کے پیروں کی جراحی کرنا، جو کہ بہت دنوں پہلے اپنے اس عمل کو ترک کر چکا تھا۔اس

کے بعد اسی مجبور ولاچار اور معاون مددگار نصرت کی داستان یعنی اس کے حزن وملال کے قصے، بس کے تنہائی پسندی اور صحرا نشینی کے واقعات، اور اس کے بعد بدکار عورتوں میں اس کی شمولیت کا جو بیان نیر مسعود نے پیش کیا ہے اسے سحر انگیز ندرت بیان کا حصہ کہنا بلا مغالطہ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

نیر مسعود کے اکثر افسانے قاری پر دوران قرأت بہت گراں گذرتے ہیں۔ کیوں کہ وہ پہلی مرتبہ کی قرأت میں قاری کی گرفت میں نہیں آتے۔ اس کی وجہ غالباً ان کی کہانیوں میں جدید افسانوی ماحول کا انتخاب ہے۔ جس کو خود نیر مسعود نے منتخب کیا ہے۔ نیر مسعود سے ان کے افسانوں کے متعلق اکثر یہ سوال بھی کیا جاتا ہے کہ ''انھوں نے اپنے افسانوں میں کیا پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔'' جس کے متعلق ان کا جواب اکثر یا تو خاموشی ہوا کرتا تھا، یا پھر وہ خود قاری کے اوپر اس کا جواب چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کے متعلق نیر مسعود کا یہ بیان قابل ذکر ہے جو سہ ماہی اردو ادب 2008 میں شایع ہوا تھا۔

''کبھی کبھی مجھ سے میرے کسی افسانے کے بارے میں پوچھا جاتا ہے کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں اور کبھی یہ کہ افسانے کا کوئی مطلب سمجھ میں نہیں آتا اس لیے یہ مہمل ہے۔ میں اس موضوع پر نہ نقادوں سے الجھتا ہوں نہ تمام پڑنے والوں سے، مجھے جو کچھ کہنا ہوتا ہے افسانے میں ہی میں کہہ دیتا ہوں۔ مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ میں اپنے افسانوں کی تاویل، تعبیر، تشریح خود کروں اور پڑھنے والوں بتاؤں کہ میں نے افسانے میں کیا کہنے کی کوشش کی ہے۔'' (سہ ماہی اردو ادب۔ ص ۷۲۔ اپریل تا جون۔ ۲۰۰۸ء۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی)

محولہ بالا اقوال میں جو بات نیر مسعود نے بیان کی ہے وہ ان کے تمام افسانوں پر مکمل طریقے سے ناموزوں معلوم ہوتی ہے۔ ہاں یہ بات الگ ہے کہ ان کے بہت سے افسانے پہلی مرتبہ میں سمجھ نہیں آتے۔ جس کا ذکر پہلے بھی کیا گیا ہے۔ یہ بالکل ویسے ہی معلوم ہوتی ہے'' جیسے کھیل کے دوران کوئی جادوگر اپنے پٹارے سے کیا نکالے گا'' دیکھنے والوں کو سمجھ میں نہیں آتا۔ نیر مسعود کے افسانوں کا اہم اسلوب رمز و کنایہ اور تمثیل ہے۔ جس کی بہترین مثال ہمیں افسانوی مجموعے'' گنجفہ'' میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ جس میں گیارہ افسانوں کو شامل کیا گیا ہے، جن میں الگ الگ موضوعات پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ افسانوی مجموعے گنجفہ میں ایک افسانہ اسی نام سے وجود ہے۔ جس کے لغوی معنی تو تاش کے پتوں کا ایک کھیل ہوتا ہے، لیکن اس کھیل کو استعارہ بنا کر نیر مسعود نے ایک ایسے نامراد طبقے کی عکاسی کی ہے جس کی زندگی افلاس و غربت کے دہانے سے باہر ہی نہیں نکلتی۔ وہ رات

دن محنت ومشقت کرنے کے باوجود بھی دو وقت کی روٹی سکون سے نہیں کھا سکتے ، اور نہ ہی انھیں بیمار ہونے پر صحیح علاج میسر ہوتا ہے۔ یہ افسانہ ایک ایسی خاتون کی حالات زندگی پر مبنی ہے جو پوری زندگی چکن کی کڑھائی کرنے میں گذار دیتی ہے اور آخر وقت میں لاعلاج بیماری میں مبتلا ہوکر اس دار فانی سے رحلت کر جاتی ہے۔ جس کی کڑھائی کے چرچے تو ولایت تک ہیں ،مگر اس کے افلاس کو کوئی قریب ترین انسان بھی محسوس نہیں کرتا۔ حالت ضعف میں جب وہ کڑھائی کرتی ہے تو اس کا جوان بیٹا جو بے روزگار ہے اور اکثر گھر پر ہی رہا کرتا ہے اپنی ماں کی حالت زار اس طرح بیان کرتا ہے۔

''میں نے گھر سے نکلنا اور بھی کم کر دیا ، زیادہ تر خالی بیٹھا بے دھیانی کے ساتھ دیکھا کرتا کہ اماں چوکی پر بیٹھی کڑھائی کر رہی ہیں اور کچھ کچھ دیر بعد کھانسنے لگتی ہیں۔ کبھی کبھی ان پر کھانسی کا دورہ سا پڑ جاتا تو میں دوڑ کر انھیں پانی پلا دیتا ، یا ان کی پیٹھ سہلانے لگتا۔ تھوڑی دیر میں وہ ٹھیک ہو جاتیں اور پھر سوئی سنبھال لیتیں۔'' "(افسانہ گنجفہ۔ گنجفہ۔ نیر مسعود۔ ص ۱۵۔ ۲۰۰۹۔ کراچی)

محولہ بالا اقتباس میں نفیس ولطیف شہر لکھنؤ کے ان کاریگروں کے حالات زندگی پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کی کاریگری اور ہنرمندی کے شہرہ ولایت تک پہنچتا تھا۔ مگر وہ ہمیشہ تنگدستی اور زبوں حالی کا شکار نظر آتے ہیں۔ اور یہ انھیں کاریگروں کی المیہ نہیں ہے، بلکہ نیر مسعود ایسے تمام طبقات کی حالات زندگی پر نوحہ کناں ہیں جو سماج کی سخت گیری کا شکار ہیں۔ کہ بظاہر تو یہ طبقہ بہت خوش نظر آتا ہے لیکن اندر سے اس کی اقتصادی بیخ کنی ہو رہی ہوتی ہے۔ ایک ادیب کا دل عجیب حساسیت کا مالک ہوتا ہے۔ وہ معاشرے کے چھوٹے بڑے سبھی مسئلوں پر گہری اور پینی نظر رکھتا ہے۔ چونکہ نیر مسعود نے اپنے ابتدائی ایام میں آزادی سے قبل کا دور بھی دیکھا ، اور تقریباً گیارہ سال کی عمر میں آزادی کی خوشیوں کو بھی محسوس کیا، لیکن انھوں نے ایک طبقے کو ترقی اور سہولتوں کو نام پر ترستے ہوئے بھی دیکھا۔ اس طبقے کو نہ آزادی سے پہلے سکون حاصل تھا اور نہ ہی آزادی کے کے بعد۔ ان تمام باتوں کو استعارہ بنا کر نیر مسعود افسانہ ''مراسلہ'' میں ایسے حکمرانوں اور حکومتوں کی بخیہ ادھیڑنے کا کام کیا ہے۔ افسانہ مراسلہ سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ نیر مسعود اپنے افسانوں میں حقیقت وتخیل کے باہمی ربط سے ایک ایسا تخیلاتی ماحول پیدا کرنا چاہتے ہیں جس میں خوشگواری اور ابہام گوئی کا ملا جلا اثر پیدا ہو۔ مراسلے کے ابتدائی حصے کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو اس سے یہ اندازہ بھی بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ یہ حصہ میں قاری سے کہیں زیادہ مصنف کا خود سے مخاطب ہے۔ اس کا ابتدا حصہ مندرجہ ذیل ہے۔

''مکرمی، آپ کت مؤقر اخبار کے ذریعے میں متعلقہ حکام کو شہر کے مغربی علاقے کی طرف متوجہ کرانا چاہتا ہوں۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج جب بڑے پیمانے پر شہر کی توسیع ہو رہی ہے اور ہر علاقے کے شہریوں کو جدید ترین سہولتیں بہم پہنچائی جارہی ہیں، یہ مغربی علاقہ بجلی اور پانی کی لائنوں تک سے محروم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کی تین ہی سمتیں ہیں۔ حال ہی میں جب ایک مدت کے بعد میرا اس طرف ایک ضرورت سے جانا ہوا تو مجھ کو شہر کا یہ علاقہ بالکل ویسا ہی نظر آیا جیسا میرے بچپن میں تھا۔" (مراسلہ۔عطر کافور۔ نیر مسعود۔ص ۱۳۔ ۱۹۹۰، بار اول۔ نظامی پریس لکھنؤ)

محولہ بالا اقتباس سے یہ واضح ہوجاتی ہے کہ آزادی سے قبل و بعد ممکنہ طور جن علاقوں یا بستیوں کو سہولتوں اور ترقی سے محروم کیا گیا ہے ان میں اکثر و بیشتر وہ علاقے یا بستیاں شامل رہی ہیں جن میں مسلم و اقلیتی آبادی کثیر تعداد میں قیام پذیر ہے۔ اس تکلیف سے نہ صرف دیہات وقصبے اور چھوٹے شہر پریشان ہیں، بلکہ میٹرو پولیٹن سٹی بھی اس متاثر ہے۔ مراسلہ میں نیر مسعود نے اسی کلفت و پریشانی کا ذکر کیا ہے۔ جس کی ابتدائی عبارت ہی اس طرف توجہ مبذول کراتی ہے۔ اس عبارت میں ''شہر کا مغربی حصہ'' لفظ اپنے اندر ایک گہرائی اور گیرائی سے متعارف کراتا ہے، اور اپنے اندر اسرار و رموز پوشیدہ رکھتا ہے۔ مذکورہ بالا تمام باتوں کو ذہن نشیں رکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ نیر مسعود کے اکثر افسانوں میں ایک سحر زدہ ماحول نظر آتا ہے۔ ان کے افسانوں میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ان کا آغاز و اختتام یکساں نہیں ہوتا۔ کسی افسانے کا آغاز تو کسی افسانے کے اختتام میں الجھاؤ ضرور نظر آتا ہے۔ کبھی کبھی تو قاری یہ بھی نہیں سمجھ پاتا کہ افسانے کا اختتام کس طرح ہو گیا ہے، اور بعض مرتبہ تو افسانے کی اختتامی عبارت ہی فضول محسوس ہونے لگتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض افسانے کا مکمل اختتام دوسرے افسانے میں ہوتا ہے۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ نیر مسعود کے افسانوں کو قاری کی تعداد بہت کم میسر آئی ہے، لیکن یہ کوئی متعجب بات نہیں ہے، بلکہ ان کے افسانوں کو سمجھنا واقعی ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ ان کے افسانے قاری سے یہ تقاضا کرتے ہیں کہ وہ ان کو کئی مرتبہ پڑھے۔ اول بار میں ان کا مطالعہ کرنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابھی ان کو مزید پڑھا جائے۔ نیر مسعود اردو افسانے کو ایسے دور میں ایک سحر زدہ اور پراسرار اسلوب سے روشناس کرایا ہے جس دور میں قصہ گوئی تقریباً زوال کا شکار ہو چکی ہے جو کہ افسانوی کائنات میں اردو داں طبقے کے لیے متحیر کر دینے والی بات ہے۔

☆☆☆

Kaifi Azmi (Monograph) ka tanqeedi Muhakema by Ibraheem Afsar

ابراہیم افسر (میرٹھ) Meerut cell-9897012528

کیفی اعظمی (مونو گراف) کا تنقیدی محاکمہ

ترقی پسند تحریک کو جن شعرا و ادبا نے اپنے خونِ جگر سے سینچا اُن میں کیفی اعظمی کا نام نمایاں ہے۔کیفی نے اپنی غزلوں، نظموں، فلمی گیتوں اور سادہ و سلیس نثر سے عوام وخواص کو متاثر کیا۔انھوں نے ہمیشہ اپنی شاعری میں ڈرامائیت کو فوقیت دی تا کہ ان کی آواز کی گونج دور تلک سنائی دے۔کیفی نے اپنے کلام میں حسن، جمال، نسوانی قدر و قیمت اور فنی نزاکتوں کو ترجیح دی۔اس لیے ان کے کلام میں جمالیاتی پہلوؤں کے علاوہ عورتوں کے مسائل کی جزئیات جا بجا موجود ہے۔

'کیفی اعظمی' (مونو گراف) کو مغربی بنگال اُردو اکاڈمی کے لیے پروفیسر صغیر افراہیم نے تحریر کیا ہے۔موصوف کی بنیادی شناخت فکشن تنقید نگار کی ہے لیکن انھوں نے ادب کی دیگر جہتوں پر بھی خاطر خواہ کام کیا ہے۔ان کی اہم کتابوں میں پریم چند-ایک نقیب، اُردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل، اُردو فکشن: تنقید وتجزیہ، افسانوی ادب کی نئی قرأت، اُردو شاعری: تنقید وتجزیہ، جگت موہن لال رواں (مونو گراف)، کڑی دھوپ کا سفر (افسانوی مجموعہ اردو، ہندی، انگریزی میں)، اُردو ناول: تعریف، تاریخ اور تجزیہ، پریم چند کی تخلیقات کا معروضی تجزیہ، اُردو افسانہ: تنقید وتجزیہ، عصرِ حاضر میں علی گڑھ تحریک کی اہمیت ومعنویت، غالبؔ، باندہ اور دیوان محمد خاں وغیرہ سرفہرست ہیں۔کیفی اعظمی پر لکھا گیا مونو گراف اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔پروفیسر علی احمد فاطمی نے پروفیسر صغیر افراہیم کی اس تحقیقی وتنقیدی مساعی پر اپنا مطمحِ نظر واضح کرتے ہوئے لکھا:

''خوشی کی بات ہے کہ ممتاز ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے اس کتاب میں ایسے راستے اپنائے ہیں جس کے نتیجے میں اچھے مباحث ونتائج سامنے آئے ہیں اور کیفی شناسی کے مثبت اثرات نظر آتے ہیں ورنہ طے شدہ ذہن اکثر کیفی کی پوری ترقی پسند شاعری کے ساتھ انصاف نہیں کر سکا ہے۔صغیر صاحب نے غیر معمولی محنت کے ذریعہ کیفی شناسی کا حق ادا کیا ہے۔'' (فلیف، کیفی اعظمی [مونو گراف]، صغیر افراہیم، مغربی بنگال اُردو اکاڈمی، 2023)

پروفیسر صغیر افراہیم نے 'کیفی اعظمی' (مونوگراف) کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں کیفی اعظمی کی شخصیت و سوانح کو پیش کیا گیا ہے۔اس باب میں آٹھ ذیلی عناوین ،سوانحی حالات، تعلیم و تربیت ،ترقی پسند تحریک سے وابستگی ،شادی اور ازدواجی زندگی ،شاعری کا آغاز، تخلیقات کا تعارف ،انعامات و اعزازات ،اور رختِ سفر کے تحت کیفی اعظمی کی سوانح و شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی و تنقیدی روشنی ڈالی گئی ہے۔کیفی اعظمی کی ولادت کے بارے میں پروفیسر صغیر افراہیم نے چونکانے والے خلاصے کیے ہیں۔مختلف راویوں نے کیفی کی ولادت میں قیاس سے کام لیا ہے۔لیکن پروفیسر صغیر افراہیم نے مختلف ادیبوں کے بیانات ،قول، حوالوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کیفی اعظمی کا سالِ ولادت 14 جنوری 1919، گاؤں مجواں، تحصیل پھول پور، ضلع اعظم گڑھ اور اصل نام سید اطہر حسین تحریر کیا۔ان کے والد سید شیخ فتح حسین رضوی اور والدہ سیدہ حفیظ النساء عرف کنیز فاطمہ تھیں۔انھوں نے اپنے تمام بچوں کو لکھنؤ اور علی گڑھ میں تعلیم دلوائی۔کیفی کے آبا و اجداد زمین دار تھے۔گھر پر شعر و شاعری کا غلغلہ رہتا تھا۔اس لیے کیفی کو بچپن سے ہی شاعری سے شغف ہوا۔ان کے تین بڑے بھائی با قاعدہ شاعر تھے۔کیفی نے پہلی غزل 11 برس کی عمر میں کہی۔اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

اتنا تو زندگی میں کسی کی خلل پڑے　　ہنسنے سے ہو سکون نہ رونے سے کل پڑے
جس طرح ہنس رہا ہوں میں پی پی کے گرم اشک　　یوں دوسرا ہنسے تو کلیجہ نکل پڑے

کیفی اعظمی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔اس کے بعد لکھنؤ واقع شیعوں کی سب سے بڑی درس گاہ سلطان المدارس میں داخل ہوئے۔اس مدرسے کے نظم و نسق کے خلاف آواز اٹھانے والوں میں کیفی پیش پیش تھے۔لکھنؤ کے قیام کے دوران ہی کیفی ترقی پسندوں کے قریب ہوئے اور یہیں وہ کمیونسٹ پارٹی کے رُکن بن گئے۔کیفی کا نکاح 23 مئی 1947 کو،شوکت کے ساتھ سجاد ظہیر کے گھر پر ہوا۔شوکت نے کیفی کے ساتھ اپنے نکاح کی تفصیلات مضمون ''کیفی میرے شوہر بھی اور دوست بھی'' میں دل چسپ انداز میں بیان کی ہیں۔دراصل شوکت، کیفی کی نظم 'تاج' کو سننے کے بعد ان سے متاثر ہوئی تھیں۔کیفی کے یہاں پہلی اولاد 1949 کو پیدا ہوئی۔اس کے بعد 18 ستمبر 1950 کو شبانہ اعظمی پیدا ہوئیں۔سردار جعفری نے کیفی کی اس بیٹی کا نام شبانہ تجویز کیا۔شبانہ کے بعد کیفی کے یہاں ایک لڑکا احمر پیدا ہوا جو فلمی دنیا میں بابا اعظمی کے نام سے مشہور ہے۔

محض 26 برس کی عمر میں کیفی اعظمی کا پہلا شعری مجموعہ ''جھنکار'' 1944 میں منظرِ عام پر

آیا۔اس مجموعے میں 56 نظموں کو شامل کیا گیا جن میں بیوہ کی خودکشی، رقاص شرارہ، مغنیہ، برسات کی ایک رات، ایک شام، صبح وطن، آواز کی شکست، کہرے کا کھیت، معذرت، آندھی، دھواں، آخری جنگ وغیرہ اہم نظمیں ہیں۔اس مجموعے کا پیش لفظ سجّاد ظہیر نے تحریر کیا ہے۔وہ کیفی اعظمی کی شاعری کے بارے میں اظہارِخیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ ہے کیفی کا تخیل اور اُن کے انقلابی واشترا کی نظموں کا رنگ۔۔۔اِس کے علاوہ اِس مجموعے میں اور بھی نظمیں ہیں جو بالکل غیر سیاسی ہیں۔غرض کہ یہ اُن کی شاعری کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔کیفی ابھی نوجوان ہیں، اُن کی عمر اس وقت 26 سال سے کم ہے اور''جھنکار'' کی تمام نظمیں، غالباً گذشتہ تین سال کے اندر کہی گئی ہیں۔کسی شاعر کی شاعرانہ زندگی کا آغاز مشکل سے اِس سے بہتر ہوسکتا ہے۔سب سے زیادہ اُمید افزا بات یہ ہے کہ ان کے کلام میں معنویت اور فن دونوں کے اعتبار سے تدریجی ترقی ہے۔''(مشمولہ کیفی اعظمی[مونوگراف]صغیر افراہیم، 2023، ص31)

کیفی اعظمی کا دوسرا شعری مجموعہ''آخرِ شب'' 1947 میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں تجدید، نقش و نگار، کرن، نئے خاکے، قومی اخبار، فیصلہ، ملاقات، اندیشے، آخری مرحلہ، نئی جنت، یلغار وغیرہ مشہور نظمیں شامل ہیں۔اس مجموعے میں 215 اشعار پر مشتمل ان کی مشہور مثنوی 'خانہ جنگی' بھی شامل ہے۔'آخرِ شب' کا پیش لفظ ایلیا اہرن برگ نے لکھا ہے۔کیفی کا تیسرا شعری مجموعہ''آوارہ سجدے'' 1973 میں منظرِ عام پر آیا۔کیفی نے اس مجموعے کا عنوان 1962 میں لکھی مشہور نظم''آوارہ سجدے'' سے ماخوذ کیا۔حالاں کہ بہت سے ناقدین نے اس مجموعے پر سخت تنقید بھی کی۔اس مجموعے کو بعض ناقدین نے کمیونسٹ پارٹی کے انتشار کی روداد قرار دیا۔اس مجموعے میں 41 نظمیں اور 11 غزلیں شامل ہیں۔مجموعے کا انتساب 'کیفی شوکت' کے نام کیا گیا ہے۔اس کا پیش لفظ فیض احمد فیض نے لکھا ہے۔اس مجموعے کے تعریف و توصیف کرتے ہوئے فیض رقم طراز ہیں:

''بنیادی طور پر کیفی کی شاعری کا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے۔غنائیہ شاعری کے سطحی تکلفات اور مصنوعی زیبائشوں سے کیفی نے بہت کم سروکار رکھا ہے۔غمِ جاناں کا ذکر ہو کہ غمِ دوراں کا، بوسۂ لب کی بات ہو کہ بوسۂ زنجیری کی، کیفی بات ہمیشہ کھری کرتے ہیں۔جیسی سفاک اور بے رحم زندگی ہمارے گرد و پیش موجود ہے۔اُسی کی بے کم و کاست منظر کشی کیفی کا مسلکِ شعر ہے۔نہ تلخیٔ مضمون سے گھبراتے ہیں نہ تلخیٔ کلام سے گریز کرتے ہیں، نہ زہر کو قند بنا کر پیش کرنے کے قائل ہیں، نہ قید کی حقیقت سے انکاری اور اس کے باوجود کیفی کی شاعری زہر اور قند کا ملغوبہ نہیں ہے بلکہ ایک متوازن

ٹھہرے ہوئے دردمند، فکر انگیز اور حساس نظریۂ حیات وفن کا بلیغ اظہار ہے جس میں کوئی جھول اور کوئی تضاد مشکل ہی سے دکھائی دے گا۔ طولِ کلام کے نہ کیفی قائل ہیں نہ میں ہوں۔ تعارف کے وہ محتاج نہیں اور تنقید کے لیے دفتر درکار ہے۔ یہ چند حروف تو محض اظہارِ خلوص کے لیے لکھ رہا ہوں اس لیے کہ میری نظر میں کیفی ایک عزیز دوست ہونے کے علاوہ ہمارے دور کے نمایندہ اور باکمال شاعرانہ مفسروں میں سے ہیں۔'' (ایضاً، ص 33-34)

1974 میں شائع مجموعہ ''میری آواز سنو'' میں کیفی اعظمی کے فلمی نغمیں شامل ہیں۔ 1983 میں ان کی طویل نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' (دوسرا اجلاس) شائع ہوئی۔ 2003 میں شبانہ اعظمی نے ان کے دستیاب کلام کو'' کیفیات'' عنوان سے مرتب کر شائع کیا۔ شبانہ اعظمی نے اپنے والد کے کلام اور اشتراکی نظریات کے بارے میں بے حد اہم باتیں' کیفیات' میں رقم کی ہیں۔ شبانہ اعظمی کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں انھوں نے اپنے والد کو جذباتی طور پر یاد کیا:

''کیفیات'' کیفی صاحب کی کلیات ہے۔ اسے اُن کی زندگی میں شائع ہونا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں ہوسکا۔ اس کا مجھے غم ہے۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ ابّا میں کسی بھی کام یا مقصد کے لیے لوگوں کو منظم کرنے کی کتنی صلاحیت تھی۔ میں نے اپنے بچپن میں انھیں مزدور کسان تحریکوں کی تنظیم کرتے دیکھا ہے، میں نے ان کے ہاتھوں اپنے آبائی گاؤں، ''مجواں'' کو جہاں پہلے صرف ٹوٹے ہوئے بے نور گھر، ویرانی اُداسی، مفلسی اور جہالت تھی، بیس برس کے عرصے میں ایک موڈل گاؤں بنتے دیکھا ہے۔'' (ایضاً، ص 34)

کیفی اعظمی کی ادبی، سماجی اور فلمی خدمات کے عوض ملک و بیرونِ ملک انعامات و اعزازات سے نوازا گیا۔ جن میں نیشنل ایوارڈ، سویت لینڈ نہرو ایوارڈ، ہندی اُردو ساہتیہ اکادمی انعام، میر تقی میر انعام، پدم شری سمان، غالب انعام، اور ساہتیہ اکادمی انعام اہمیت کے حامل ہیں۔ وشو بھارتی یونی ورسٹی اور شانتی نکیتن نے کیفی اعظمی کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے سرفراز کیا۔ عمر کے آخری ایام میں کیفی اعظمی کو مختلف عوارض نے جکڑ لیا تھا۔ حالاں کہ 1973 میں برین ہیمر یج بھی ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ادبی، سماجی اور فلمی کاموں میں مصروف رہے۔ 1978 میں ان کی بائیں پیر کی ہڈّی بھی ٹوٹ گئی تھی۔ کیفی تا عمر اپنے آبائی وطن' مجواں' کو ذہن سے نہ نکال سکے۔ کیفی اعظمی 10 مئی 2002 کو اپنے حقیقی رب سے جا ملے۔

پروفیسر صغیر افراہیم نے'' کیفی اعظمی' مونوگراف کا دوسرا باب ''ادبی و تخلیقی سفر'' عنوان

سے قائم کیا ہے۔اس باب میں کیفی کی غزلیہ شاعری،کیفی کی نظم نگاری،کیفی بہ حیثیت نثر نگار اور کیفی کے فلمی نغموں کا محاکمہ پیش کیا ہے۔کیفی اعظمی نے نظموں کے مقابلے غزلیں کم کہیں حالاں کہ انھوں نے اپنی شعری زندگی کا آغاز غزل سے ہی کیا تھا۔لیکن انھوں نے جو غزلیں کہیں ان میں دردو سوز،صوتی آہنگ کے علاوہ پیکر تراشی و جمالیات کے رنگوں کو خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔پروفیسر صغیر افراہیم نے اپنے مونوگراف میں غزلوں کے صرف مطلعوں کو شامل کر ان پر تنقیدی بحث کی ہے۔کیفی کی غزلوں کے چند مطلع ملاحظہ کیجیے:

سب اجنبی ہیں یہاں،کون کس کو پہچانے ــــ سُنا کرو میری جاں اِن سے اُن سے افسانے

نئی زمیں نیا آسماں نہیں ملتا ــــ میں ڈھونڈھتا ہوں جسے وہ جہاں نہیں ملتا

اس سر پہ جھوم کے جو گھٹائیں گزر گئیں ــــ کیا جانے کس کی پیاس بجھانے کدھر گئیں

ان غزلوں پر تنقیدی رائے کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر صغیر افراہیم نے لکھا کہ مذکورہ مطلعوں سے تمام غزلوں میں ایک پُرکشش،دھیما اور مترنم لہجہ ہے۔پہلے مطلع کے توسط سے غزل پر غور کیجیے تو بیزاری،اُکتاہٹ اور سرد مہری اپنے پاؤں پسارے نظر آتی ہے جہاں ہر شخص حیران و پریشان سا ہے۔(ص44)

پروفیسر صغیر افراہیم نے کیفی کی مشہور و معروف نظموں کا تجزیہ 'کیفی کی نظم نگاری' میں کیا ہے۔موصوف نے یہاں تک لکھا کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعرا کی پہلی ترجیح نظم نگاری رہی ہے۔یہ بات سو فی صدی سچ بھی ہے۔ترقی پسند تحریک کے نمائندہ شعرا کے کلام کا مطالعہ کیجیے تو اس میں زیادہ تر نظمیں قارئین کو ملتی ہیں۔ان شاعروں نے رومان اور انقلاب کے حسین امتزاج سے اپنی نظموں میں ایک خاص قسم کا کینوس تیار کیا۔مزدوروں،بے کسوں،عورتوں،سماجی،سیاسی اور ملکی مسائل پر ترقی پسندوں نے جم کر لکھا۔کیفی بھی ان معاملات میں دوسرے شعرا سے پیچھے نہیں تھے۔انھوں نے مترنم اور اور شگفتہ لہجے کو اپنے لیے مختص کیا۔ان کے شعری مجموعے''جھنکار''میں شامل نظموں بالخصوص بیوہ کی خودکشی،آواز کی شکست،کش مکش،کہرے کا کھیت،برسات کی ایک رات،بیکاری، بیکار مزدور وغیرہ میں انھوں نے ہر طبقے کی نمایندگی کی ہے۔دراصل ان کی جدید شاعری نے بہت جلد مقبولیت کے مدارج طے کیے اور خود سجّاد ظہیر کو کیفی کی شاعری اور ان کے شعری رچاؤ و جذبات کے بارے میں کہنا پڑا کہ جدید شاعری کے باغ میں ایک نیا پھول کھلا ہے،ایک سُرخ پھول۔کیفی کے مجموعے''جھنکار''کے پیش لفظ میں سجّاد ظہیر لکھتے ہیں:

''کیفی ابھی نوجوان ہیں، ان کی عمر اس وقت 26 سال سے کم ہے اور ''جھنکار'' کی تمام نظمیں، غالباً گذشتہ تین سال کے اندر کہی گئی ہیں۔ کسی شاعر کی شاعرانہ زندگی کا آغاز مشکل سے اس سے بہتر ہو سکتا ہے۔ سب سے زیادہ اُمید افزا بات یہ ہے کہ ان کے کلام میں معنویت اور فن دونوں کے اعتبار سے بتدریجی ترقی ہے۔ یہ صحیح ہے ابھی اُن کے کلام میں وہ گہرائیاں پیدا نہیں ہوئیں جو صرف علمی عبور، نیز مشاہدے اور کثیر تجربوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔''

(پیش لفظ، جھنکار، قومی دارالاشاعت بمبئی، 1944، ص8)

''جھنکار'' کی طرح کیفی اعظمی نے اپنے دوسرے مجموعے ''آخرِ شب'' میں بھی انقلابی اور رومانی نظموں کو فوقیت دی۔ دراصل اس مجموعے میں کیفی نے آزادی سے قبل لکھی گئی نظموں کو شامل کیا ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے لیکن انھوں نے سیاسی رہنماؤں بالخصوص کانگریسی لیڈروں کی شان اور ان کی جرأت مندانہ اقدام کی تعریف بھی کی ہے۔ اس مجموعے میں کیفی کے سیاسی نظریات کے بھی دیدار جا بجا ہوتے ہیں۔ اس مجموعے میں ان کی مشہور نظموں میں تجدید، حوصلہ، تبسم، نرسوں کی محافظ، نغمگی، تم، تصور، دوراتیں، ملاقات، پشیمانی، نقش و نگار، اندیشے، نصیحت، فیصلہ، تلاش، آخری مرحلہ، مُژدہ، تربیت، نئے خاکے، کرن، نئی جنت، ہم، سویت یونین اور ہندوستان وغیرہ اہمیت کی حامل ہیں۔ اس مجموعے کا پیش لفظ ایلیا اہرنبرگ نے لکھا۔

کیفی اعظمی کے نظموں اور غزلوں کے تیسرے مجموعے ''آوارہ سجدے'' میں تقسیم ملک اور کمیونسٹ پارٹی کے بکھراؤ کے آثار نظر آتے ہیں۔ اس مجموعے کا پیش لفظ فیض احمد فیض نے ماسکو سے 14 ستمبر 1974 میں لکھا جس میں انھوں نے کیفی کے نظریات اور کلام پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ کیفی نے بھی ''دو چار باتیں'' عنوان سے اپنے دل کے جذبات اور کیفیت کو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ دراصل یہ دو چار باتیں ان کی اعلا نثر کا بہترین نمونہ ہیں۔ اس مجموعے کی مشہور نظموں میں دعوت، ایک بوسہ، تلنگانہ، مکان، آوارہ سجدے، نہرو، آخری رات، ابنِ مریم، بہروپنی، نذرانہ، دوسرا طوفان، پیار کا جشن، ماسکو، گربھ وتی، کھلونے، دھماکہ، زندگی، ایک دعا اور چراغاں کا نام سرفہرست ہے۔ کیفی نے اس مجموعے کا انتساب اپنی شریکِ حیات 'شوکت کیفی' کے نام کیا:

ایسا جھونکا بھی اک آیا تھا کہ دل بجھنے لگا — تو نے اُس حال میں بھی مجھ کو سنبھالے رکھا
کچھ اندھیرے جو میرے دم سے ملے تجھ کو — آفریں تجھ کو کہ نام اُن کا اُجالے رکھا

میرے یہ سجدے جو آوارہ بھی ہیں بدنام بھی ہیں   اپنی چوکھٹ پہ سجا لے جو ترے کام کے ہوں

علامہ اقبال کی مشہور نظم 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' کی طرز پر کیفی اعظمی کی نظم 'ابلیس کی مجلس شوریٰ (دوسرا اجلاس)(1983) جب منظرِ عام پر آئی تو ادبی حلقوں میں چہ مہ گوئیاں شروع ہوئیں۔کیفی نے اس کتاب کا انتساب سبطِ حسن کے نام کیا ہے۔اس نظم کا تنقیدی محاکمہ اور موازنہ سردار جعفری نے 'پیش لفظ' میں کیا ہے۔ در اصل کیفی نے اس نظم میں اشتراکی نظام اور اس کے نظریات کا خیر مقدم کیا ہے۔حالاں کہ انھوں نے اس نظم اور اقبال کی نظم سے موازنے پر جواب دیتے ہوئے ''بیانِ صفائی'' میں لکھا:

''ابلیس کی مجلس شوریٰ (دوسرا اجلاس) لکھ کے میں اپنے کو ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا پاتا ہوں۔اور اپنے ضمیر کو انصاف کی کرسی پر بٹھا کے اپنی صفائی پیش کر رہا ہوں کہ جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا۔آج سے کوئی 35-30 برس ادھر جب میں نے پہلی مرتبہ ڈاکٹر اقبال کی مشہور نظم ابلیس کی مجلس شوریٰ پڑھی تھی تو اس سے متاثر ہوا تھا اور مرعوب بھی لیکن بعد میں جب تاریخ کی ٹھیک وہی رفتار نہیں رہی ابلیس نے جس کی پیشین گوئی کی تھی تو بار بار یہ خواہش جاگی کہ میں ابلیس کی مجلس شوریٰ کا دوسرا اجلاس بلاؤں اور اس کی روداد قلم بند کروں لیکن ایک تو اقبال کے لہجے اور آہنگ سے اتنا مرعوب تھا کہ قلم اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔دوسری یہ جھجک بھی تھی کہ میرا شمار لکھنؤ کے ان شاعروں میں نہ ہونے لگے جنھوں نے شکوہ کے جواب میں لمبی لمبی نظمیں لکھیں۔جعفری صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنے پیش لفظ میں یہ بات صاف کر دی ہے کہ یہ نظم اقبال کا جواب نہیں ہے۔''

(ابلیس کی مجلس شوریٰ (دوسرا اجلاس) کیفی اعظمی، 1983، ص 4)

پروفیسر صغیر افراہیم نے کیفی اعظمی کی نظم نگاری کا احاطہ پیش کرتے ہوئے لکھا کہ:

''انسانیت، محبت، مروت، خلوص، تحمل اور مساوات جیسے احساسات کو کیفی اعظمی نے اپنی نظموں میں مختلف وسیلوں اور کہیں کہیں تلازموں کے ذریعے پیش کیا ہے۔نیز فطرت کے عمل، اُس کے مظاہر اور انسانی جبلت میں ہم آہنگی کو منعکس کرنے کے لیے انھوں نے علامتوں اور تلمیحوں سے کام لیا ہے۔۔۔اُن کی نظم نگاری کا یہ بھی فنی کمال ہے کہ انھوں نے جہاں مصرعے کو ایک اکائی کے طور پر استعمال کیا ہے وہاں وہ اکائی آگے پیچھے کے مصرعوں سے مربوط ہوتی ہے۔یہ ربط کہیں واضح کہیں دھندلا نظر آتا ہے۔''(کیفی اعظمی [مونوگراف] صغیر افراہیم، 2023، ص 59-58)

پروفیسر صغیر افراہیم نے 'کیفی بہ حیثیت نثر نگار'' میں کیفی اعظمی کی نثر نگاری کا تنقیدی جائزہ

پیش کیا ہے۔ اس ذیلی باب میں کیفی اعظمی کے اپنے شعری مجموعوں پر لکھے پیش لفظ ، کے علاوہ مضامین، تبصروں کوموضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے۔کیفی کےمضمون 'میں اور میری شاعری' کوادبی حلقوں میں خوب پذیرائی حاصل ہوئی۔اس سوانحی مضمون میں کیفی نے اپنے حالاتِ زندگی، تعلیم وتربیت اور شاعری کے آغاز کے علاوہ راز و نیاز کی باتوں کو قارئین کے سامنے پیش کیا۔کیفی نے اپنے عزیز دوست ساحرؔ لدھیانوی کی شخصیت اور ان کی شاعری کے حوالے سے ایک طویل مضمون تحریر کیا تھا۔اس مضمون میں کیفی نے اپنی نثری جولانیوں کا بہ خوبی استعمال کیا۔علاوہ ازیں انھوں نے 'نئے ادب کے معمار' کےتحت ساحرؔلدھیانوی پر مونوگراف لکھا۔کیفی اعظمی نے اپنے ابتدائی ادبی دور میں کتابوں پر تبصرے بھی کیے۔ان کے تبصروں میں اعتدال کا پرچم بلند رہا۔

کیفی اعظمی کے لکھے فلمی نغموں کی تعداد سیکڑوں سے تجاوز ہے۔حالاں کہ انھوں نے عصمت چغتائی کے مشورے سے فلموں میں نغمے لکھنے کا آغاز 1952 میں شاہد لطیف کی فلم ''بزدل'' سے کیا۔کیفی نے اپنے فلمی نغموں میں تُک بندی سے مکمل انحراف کیا۔ان کے نغموں میں شعریت اور ادبی چاشنی اور بلند آہنگی کا خاص اہتمام ملتا ہے۔فلم 'کاغذ کے پھول'(1959)اور'حقیقت'(1965) کے نغموں نے فلمی دنیا میں بامِ عروج عطا کیا۔حب الوطنی کے جذبے سے سرشار اس فلم نے ہندوستانی فلموں کو نئی سمت و جہت عطا کی۔لتا منگیشکر، محمد رفیع کی آواز اور مدن موہن کی موسیقی نے لوگوں کے دلوں کو مسحور کیا۔منظوم مکالموں سے مزئین فلم 'ہیر رانجھا'(1970) کے مکالمے اور نغمے بھی کیفی نے ہی لکھے۔اس فلم نے ہندوستانی فلموں میں اپنا منفرد مقام حاصل کیا۔کیفی نے فلم 'گرم ہوا' کے نغمے، کہانی کے علاوہ اسکرین پلے بھی لکھا۔فلم 'منتھن' کا اسکرپٹ تیار کیا۔کیفی نے بعض فلموں میں نغموں کی جگہ خالص ادبی غزلوں کا استعمال کیا جسے سامعین اور ناظرین نے خوب پسند کیا۔فلم 'ارتھ' میں کیفی کی غزلوں نے نئے ریکارڈ قائم کیے۔فلم 'پاکیزہ' کے نغموں میں موجود کلاسیکل انداز کو لوگوں نے خوب پسند کیا۔کیفی نے اپنے فلمی نغموں میں ہمیشہ ادبی روایت کوملحوظ رکھا۔

پروفیسر صغیر افراہیم نے باب سوم 'کیفی کی شاعری کا تنقیدی محاکمہ' میں چار ذیلی عنوان قائم کیے ہیں۔ان میں (۱)تنقیدی مباحث (۲)خانہ جنگی (۳)عورت کا تصور (۴)اہمیت اور افادیت پر خاص توجہ مرکوز کی ہے۔موصوف نے 'تنقیدی مباحث' میں کیفی کے نظریات، فکر اور ان کے ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوکر تخلیق کیے گئے ادب پر بحث کی ہے۔'خانہ جنگی' میں پروفیسر صغیر افراہیم نے کیفی کی طویل مثنوی 'خانہ جنگی' پر اپنا مطمحِ نظر پیش کیا۔اس ضمن میں انھوں نے لکھا کہ اُردو

ادب میں بہت سی طویل مثنویاں لکھی گئی ہیں لیکن کیفی اعظمی نے 'خانہ جنگی' میں حقائق کی بازیافت کی ہے۔موصوف نے سردار جعفری کی مثنوی 'جمہور' اور کیفی کی مثنوی 'خانہ جنگی' کا موازنہ بھی کیا۔کیفی نے 'خانہ جنگی' کا آغاز مرزا غالب کے شعر:

کوئی اُمید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی

سے کیا ہے۔پروفیسر صغیر افراہیم نے اس مثنوی پر اپنی تنقیدی رائے کے علاوہ گیان چند جین، علی احمد فاطمی وغیرہ کی آرا کو بھی شاملِ مونوگراف کیا ہے۔'عورت کا تصور' میں پروفیسر صغیر افراہیم نے کیفی کی شاعری اور نظریات میں عورت کی عزت، تصور، مقام کا تنقیدی محاکمہ پیش کیا۔کیفی نے اپنی شاعری میں عورت اور مرد کے درمیان حائل اونچی اونچی دیواروں کو نہ صرف توڑا بلکہ تفریق کے پردوں کو نوچا بھی۔'عورت' عنوان سے انھوں نے مشہور نظم لکھی۔یہ نظم ان کے صنفِ نازک کے تئیں مقدس افکار و خیالات کا اعلا نمونہ ہے۔اس لیے انھوں نے کہا:

توڑ کر رسم کے بُت بندِ قدامت سے نکل ضعفِ عشرت سے نکل وہمِ نزاکت سے نکل
نفس کے کھینچے ہوئے حلقۂ عظمت سے نکل قید بن جائے محبت تو محبت سے نکل
راہ کا خار ہی کیا گل بھی کچلنا ہے تجھے اُٹھ میری جان! مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے!

کیفی اعظمی کے کسی بھی شعری مجموعے کا مطالعہ کیجیے ان میں آپ کو عورتوں کی عظمت سے متعلق نظمیں مل جائیں گی۔کیفی نے اپنے شعری مجموعے 'آوارہ سجدے' کا انتساب شوکت کیفی کے نام کیا۔اس طرح انھوں نے دنیا کی تمام عورتوں کے وقار و افتخار کو مزید بلند کیا۔

پروفیسر صغیر افراہیم نے 'اہمیت و افادیت' میں کیفی اعظمی کی ادبی جہتوں پر تنقیدی بحث کی ہے۔انھوں نے کیفی اعظمی کی شاعری میں پنہاں ڈرامائی پہلوؤں کو قارئین کے سامنے پیش کرتے ہوئے ان پر تبادلۂ خیال کیا۔اس بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ شاعرانہ حُسن و جمال اور اُس کی موسیقی کو بھی پورے طور پر برقرار رکھا ہے۔پروفیسر صغیر افراہیم نے ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر لکھے گئے کیفی کی شاعری، فلمی نغموں، اِپٹا کے ڈراموں وغیرہ میں شرکت پر بھی گفتگو کی ہے۔اس ضمن میں انھوں نے فلمی نغموں، نظموں وغیرہ کے حوالے اس باب میں پیش کیے ہیں۔

باب چہارم 'انتخابِ کلام' میں (۱) غزلیں (۲) نظمیں (۳) مثنوی اور (۴) فلمی نغمے کے تحت کیفی اعظمی کی شاعری کا انتخاب شامل کیا ہے۔پروفیسر صغیر افراہیم نے کیفی کی 9 غزلیں، 7 نظمیں، 1 مثنوی اور 8 فلمی نغموں کا انتخاب قارئین کے سامنے پیش کیا۔اس موقع پر کیفی کی مشہور نظم 'دوسرا بن

باس' کا آخری بند ملاحظہ کیجیے جس میں بابری مسجد کے شہید ہونے کے بعد کے منظر اور پس منظر کو درد و سوز کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

پاؤں دھوئے بنا سرجو کے کنارے سے اُٹھے رام یہ کہتے ہوئے اپنے دوارے سے اُٹھے

راجدھانی کی فضا آئی نہیں راس مجھے چھ دسمبر کو ملا ہے دوسرا بن باس مجھے

بہرکیف! پروفیسر صغیر افراہیم نے زیرِنظر مونوگراف میں کیفی اعظمی کی شخصیت اور شاعری کو مختصر لیکن جامع انداز میں تحریر کیا ہے۔انھوں نے کیفی اعظمی کی زندگی کے تمام اہم واقعات کو سلسلے وار قلم بند کیا۔ یہاں تک کہ ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو تنقیدی زاویوں سے پرکھا ہے۔کیفی کے فلمی نغموں میں موجود ادبی چاشنی اور جمالیات پر غور وخوض کیا ہے۔کیفی کی نثر نگاری کی فنی خوبیوں پر اپنا نقطۂ نظر واضح کیا ہے۔اس مونوگراف کے منظرِ عام پر آنے سے کیفی اعظمی کی مختلف جہتوں اور پہلوؤں سے ہم روبرو ہوئے ہیں۔اس موقع پر یہ کہنا لازمی ہے کہ اگر کیفی کے لکھے خطوط اور انٹرویوز کو بھی اس مونوگراف میں شامل کر لیا جاتا تو اس کی اہمیت میں مزید اضافہ ہوتا۔امید کی جاتی ہے کہ پروفیسر صغیر افراہیم اس اہم نکتے کی جانب اپنی توجہ مبذول ضرور کریں گے۔

☆☆☆

Tahreek-e-adab ki Khidmat (Afsano ke hawale se) by Dr. Sajid Ali

(Asst.Prof.DRT,s A.E.Kalsekar Degree College,Mumbra,Thane)

ڈاکٹر ساجد علی (ممبرا، تھانے) cell-9004302254

تحریک ادب کی خدمات (افسانوں کے حوالے سے)

سہ ماہی رسالہ ''تحریک ادب'' کا پہلا شمارہ ۲۰۰۸ء کے نصف آخر میں وارانسی (بنارس) اتر پردیش سے شائع ہوا۔ پہلے شمارے سے ہی یہ کوشش رہی کہ اس میں ادب کی تمام اصناف کے معیاری مواد کو جگہ دی جائے۔ ان تخلیق کاروں کا خاص خیال رکھا گیا جو کسی بنا پر ادب میں اس طور اپنی شناخت نہیں بنا سکے تھے جو ان کی تحاریر کا حق تھا۔ اس کے علاوہ ان تخلیق کاروں کو بھی ادب کی جانب از سر نو راغب کرنے کی کامیاب کوششیں کی گئیں جو عدم مصروفیت یا دوسری بنیادوں پر ادب سے دور ہو گئے تھے یا پھر اس جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دے پا رہے تھے۔ اس کے علاوہ ادب کی نئی بستیوں میں اردو کی خدمت کر رہے ادبا و شعرا بھی مرکز توجہ رہے۔

تحریک ادب کے پہلے شمارہ میں جو افسانوی تحریریں شامل ہوئیں، ان میں سائبیریا (نجم الحسن رضوی، دبئی) اندھی گلی (اسلام عظمی، دبئی) حساب جیومیٹری (آنند لہر، جموں) ٹائلیٹ پیپر (فیصل نواز چودھری، ناروے) ہجرت (امجد مرزا، لندن) کروٹ (پروفیسر ڈاکٹر عبد القدر فاروقی، امریکہ) خطوط عنقا ہو گئے (پروفیسر شمیم علیم، امریکہ) بو (ڈاکٹر بلند اقبال، کناڈا) سرکل لائن (فہیم اختر، لندن) پچاسویں سالگرہ، عادی چور، کنڈکٹر (افسانچے، سرسر غزالی، جرمنی) ہیں۔ دوسرے شمارہ میں، درد کی حد سے پرے (جتندر بلو، لندن) بے سری (یعقوب تصور، ابوظبی) نیچر کیور (نثار راہی، بھوپال) زخم انا (ڈاکٹر رینو بہل، چنڈی گڑھ) گیلی مٹی (نور شاہ، سرینگر) ایک اور امید (دیپک کنول، ممبئی) تیرہویں سیڑھی (شاہین رضوی، کویت) رکشہ والا (فہیم اختر) فٹ پاتھ، تعویز (افسانچے، سرور غزالی) دیوار (فرخندہ رضوی، یو۔کے) شامل ہیں۔ شمارہ ۳ میں مہابھارت (جوگندر پال، نئی دہلی) ستیہ کے بکھرے ہوئے بال (ڈاکٹر بلند اقبال) مغرب میں مشرق (نقشبند قمر نقوی بھوپالی، امریکہ) آستانہ (شاد عباسی، وارانسی) غفار (ڈاکٹر وسیم

صدیقی،کویت)عمر دراز مانگ کر(رضیہ مشکور،امریکہ) نندی(ڈاکٹر خان حفیظ،کانپور)پت جھڑ کے لوگ(سلمیٰ صنم ،بنگلور)۔

شمارہ ۴ ، میں ڈاکٹر بلند اقبال(کناڈا) جو کہ معروف شاعر حمایت علی شاعر کے فرزند ارجمند ہیں ،کی افسانہ نگاری پر خصوصی گوشہ شائع ہوا،جن میں مستند اہل قلم کی تحاریر شامل تھیں ۔مضامین میں ڈاکٹر بلند اقبال کے افسانے بحوالہ ''فرشتے کے آنسو' (انیس رفیع ،کولکاتا)ڈاکٹر بلند اقبال اور افسانہ(ضامن جعفری، پاکستان)ڈاکٹر بلند اقبال ۔۔۔میرے ادیب اور طبیب دوست(خالد سہیل،کناڈا)ڈاکٹر بلند اقبال کے افسانے'' فرشتے کے آنسو' (طاہر نقوی، پاکستان)ڈاکٹر بلند اقبال کے افسانوں کی فکری جڑیں (معید رشیدی،دہلی)فرشتے کے آنسو(عنبرین حبیب عنبر)نقش فریادی (فیاض احمد وجیہہ،دربھنگہ)ڈاکٹر بلند اقبال: نئے افسانے نئی جہات(جاوید انور، وارانسی)شامل ہیں۔بلند اقبال کے منتخب افسانوں میں بھینٹ ،گدھ،کارٹون ، بے زمینی نسل کشی ہے،لفظ جو طوائف بن گئے،نہیں،شائع ہوئے۔افسانوں کے ذیل میں انصاف (آنند لہر) بینا محبت (یعقوب تصور)سوندھی مٹی کا عطر(پروفیسر شمیم علیم)بلیدان (محمد بشیر مالیرکوٹلوی، مالیرکوٹلہ) پرائی دھرتی کا عذاب (اشتیاق سعید،ممبئی)شامل ہیں ۔شمارہ ۵، میں بھی کئی افسانے شامل تھے لیکن اس کا کوئی نسخہ ریکارڈ میں موجود نہیں ہے،اتنا یاد پڑتا ہے کہ اس میں بھی معروف افسانہ نگار آنند لہر کے فن پر گوشہ شامل تھا۔

شمارہ ۷، ۶ جو کہ مشترکہ شمارہ تھا، میں پیارے زخم (آنند لہر)ٹائگر (یٰسین احمد،حیدرآباد)لذت خلوت (دیپک بدکی، غازی آباد)ستی سر کا سورج (خالد حسین ،جموں) سرکل لائن کی ٹرین (حمیدہ معین رضوی، یو۔کے)ویزا، پالش والا صاحب، گناہ کبیرہ، پابندی، فرض شناس(افسانچے ،سرور غزالی) باغی (مشتاق احمد وانی ،اودھم پور)خلش (ڈاکٹر وسیم صدیقی) آخری راز (مسرت ناہید، ساؤتھ ویلز) کچھ تو بولو(اشفاق برادر، کانپور)۔شمارہ آٹھ میں ہائی وے (انیس رفیع ،کولکاتا)ورطہ (بلراج بخشی ،اودھم ہور) پناہ گاہ کی تلاش (سلیم خاں ہمزاد،کولکاتا) ممتا کی زنجیر (ڈاکٹر نرگس جہاں، پٹنہ) پریت نہ کریو کوئے (عامر مصطفیٰ رضوی، امروہہ)خوشبو کا سفر (ڈاکٹر بلند اقبال) پیاسی ندیا (فہیم اختر) تضاد (رخسانہ نازنین، بہار) زود پشیماں (نوشابہ خاتون، پٹنہ)۔

شمارہ ۱۱، ۱۰، ۹ مشترکہ شمارہ تھا جس میں کوئی افسانہ شامل نہیں تھا۔اسی طرح شمارہ ۱۳، ۱۲ میں بھی کوئی افسانہ شائع نہیں ہوا۔اس کی کیا وجوہات ہیں ،اس کا ذکر آگے آئے گا۔شمارہ

۱۴، میں یو۔کے میں مقیم معروف افسانہ نگار حمیدہ معین رضوی پر گوشہ شائع ہوا۔جن اہل قلم کے مضامین ان کےفن پر شامل تھے وہ درجہ ذیل ہیں۔تعارف(علی بن عزیز رضوی)داستان در داستان گو(امین مغل)حمیدہ معین رضوی کے تین افسانے(طاہر نقوی، پاکستان)حمیدہ معین رضوی(تسلیم الٰہی زلفی،کناڈا)بڑے بھیاّ(مصطفیٰ کریم،یو۔کے)۔حمیدہ معین رضوی کا ایک افسانہ بڑے بھیا بھی شامل تھا۔افسانوں کی فہرست میں بھوک کو بھوجن کیا(خالد حسین)گلوبل وارمنگ(فیض الحسن،ممبئی)دوحکمرن(زنفر کھوکھر،راجوری)دوراہے پر کھڑی زندگی(سید احمد قادری،گیا)کتنے بھنور(کہکشاں انجم۔گڑگاؤں)ماں(ڈاکٹر ریاض توحیدی،کپواڑہ)احساس کی کرچیاں(محمد قیوم میو،آگرہ) جب گدھ لوٹ آئے(شفیق مسعود ،راجوری)رشتوں کا کرب(ڈاکٹر محمد نظام الدین، بیدر)معصوم خواہش(اشفاق برادر)۔

شمارہ ۱۵، میں وحشی سعید کو ایک عرصہ(تقریباً چالیس سال بعد)از سرنو تحریک ادب نے دریافت کیا ان کے افسانے کشکول،مٹھی اڑان آسمان،آتش بیان،طلسم کلام، پہچان،خودسری اس میں شامل تھے۔اسی کے ساتھ وہ تحریک ادب میں متواتر شائع ہوتے ہیں۔شمارہ ۱۶ میں آنند لہر کا گوشہ شامل تھا،جس میں درج ذیل مضامین شامل تھے۔آنند لہر:احترام انسانیت کا فن کار(پروفیسر قدوس جاوید،جموں)محبت وایثار کا ترجمان:نام دیو(ڈاکٹر مجیر احمد آزاد(دربھنگہ)جموں وکشمیر کا اہم فکشن نگار آنند لہر(ایم۔قدیر مہتاب،راجوری)شمارہ ۵ میں آنند لہر کے فن پر جو مضامین شامل تھے وہ یہ ہیں۔مجھ سے کہا ہوتا ،گوش بر خوب آواز(خان احمد فاروق،کانپور)یہی سچ ہے کی فکری صداقت(ڈاکٹر مجیر احمد آزاد)آنند لہر کی ناول نگاری 'مجھ سے کہا ہوتا' کی روشنی میں (دل تاج محلی،آگرہ)آنند لہر :ایک ناقابل فراموش افسانہ نگار(ڈاکٹر خان حفیظ)۔شمارہ ۱۶ میں شامل افسانوں کی فہرست یہ ہے۔اپنا عکس اپنا آئینہ،میٹھا چشمہ اور میں،عجب پریم کہانی،لمبا آدمی چھوٹا قد،وہ صبح کب آئے گی(وحشی سعید)کشمیر کہانی۔۔۔دو ہزار گیارہ(نور شاہ)ادھورا مرا آدمی(رونق جمال،چھتیس گڑھ)۔

شمارہ ۱۷ میں صرف ایک افسانہ نجات دہندہ(وحشی سعید)شمارہ ۱۸ میں سائے کی لاش(وحشی سعید)دیوار پر لکھے حرف(خالد حسین)پرائی ناک(نور شاہ)تنہائی کا کرب(ڈاکٹر نرگس جہاں)گلوبل جھوٹ(ڈاکٹر ریاض توحیدی)۔شمارہ ۱۹ میں وحشی سعید کے افسانے کب آئے گا وہ سقراط،جمود کا جنازہ،نامکمل تصویریں،یہ تہذیب یافتہ لوگ،سودا،خواب حقیقت۔شمارہ ۲۰ میں بھی

وحشی سعید کا میرا تخلیقی سفر اور انتظار اور میں شامل ہیں۔شمارہ ۲۱ میں نئی قیامت (نورشاہ) ریزہ ریزہ تبسم (اختر کاظمی، فتح پور) میری کاوش کا صلہ (کہکشاں انجم) مگر گاؤں آج کیا ہوا (سلیم احمد فاروقی، جموں)۔شمارہ ۲۲ میں علی گڑھ کی معروف شخصیت اور فکشن نگار اکرم شروانی پر گوشہ شائع ہوا جس میں پروفیسر صغیر افراہیم کے تعارف اور ڈاکٹر سیما صغیر سے اکرم شروانی کی گفتگو کے علاوہ ان کے افسانے ثبوت، نقش ثانی، شریک حیات اور قسمت کا لکھا شامل ہیں۔افسانوں کی فہرست میں آنند لہر کا ایک افسانہ 'سرحد کی آواز' شامل ہے۔شمارہ ۲۳ میں فطرت۔۔۔نفرت۔۔۔ندامت (وحشی سعید) کائنات شرما اٹھی (محمد ایوب شبنم، سورن کوٹ) راکھ ہوتی زندگی (حسن ساہو، سرینگر) آخری آدمی (زاہد مختار، اننت ناگ) لہو کا چراغ (ایثار کاشمیری، ترال)۔شمارہ ۲۴ میں گوشہ آنند لہر میں ایڈوکیٹ شمس الدین شاز کے مضمون 'جموں وکشمیر میں اردو کا انمول ہیرا' کے علاوہ آنند لہر کے افسانے انوکھے زخم، الگ صوبہ، سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے، دوسری بے انصافی۔افسانوں کی فہرست میں چھڑا کر ہاتھ اپنوں سے (واجدہ تبسم گورکو، سرینگر) گزر سکے تو گزر جا (کہکشاں انجم) منفی کا قائدہ، اندراج، آتش بیان (وحشی سعید) شمارہ ۲۵ میں گوشہ وحشی سعید میں دو حرف (پروفیسر عبد القادر سروری) وحشی سعید ساحل (جان محمد آزاد) ماضی اور حال 'جلد اول' اور ماضی اور حال 'جلد دوم' (جاوید انور) انسانی نفسیات کے ماہر ناول نگار وحشی سعید (رئیس الدین رئیس، علی گڑھ) اور ان کے منتخب افسانے بھنگی، دانت، جب کتا بولتا ہے، سب غلط ہے۔۔۔سب ٹھیک ہے، خاندانی خون، عجب فطرت تھی اس کی، چور پولیس، قلم، وہ صبح کب آئے گی۔

شمارہ ۲۶ میں انوکھی دعا (آنند لہر) آشوب آگہی، جدا جدا راستے (وحشی سعید)۔شمارہ ۲۷ میں معروف افسانہ نگار احمد رشید (علی گڑھ) پر گوشہ شائع ہوا جن میں احمد رشید: ایک منفرد افسانہ نگار (عبدالصمد) احمد رشید کے افسانے (پروفیسر شافع قدوائی) احمد رشید کا افسانوی مجموعہ: بائیں پہلو کی پسلی (پروفیسر صغیر افراہیم) فلسفۂ زیست کی کہانیاں (پروفیسر علی احمد فاطمی) احمد رشید کا فنی نظام (ڈاکٹر سیما صغیر) احمد رشید کے افسانے۔۔۔مذہبی تناظر میں (ڈاکٹر محمد الیاس قاسمی) وہ اور پرندہ۔۔۔فنی محاسبہ (محمد غالب نشتر) احمد رشید کا اختصاص (حسام الدین) منتخب افسانوں میں بائیں پہلو کی پسلی، بجوٹ، کھوکھلی گگر، ویٹنگ روم۔افسانوں کی فہرست میں جھوٹے لوگ (آنند لہر) شکارا جا رہا تھا (ظہور احمد ترمبو، سرینگر) طوفان، گھاس کا تنکا (وحشی سعید)۔

شمارہ ۲۸ میں بت پرست (وحشی سعید) روحیں (خالد حسین) خمیدہ سروں کی جستجو (ڈاکٹر

ISSN-2322-0341

رینو بہل)وردان (کہکشاں انجم) شمارہ ۲۹ میں گوشۂ وحشی سعید میں وحشی سعید کے افسانے (شمس الرحمن فاروقی)وحشی سعید کی افسانہ نگاری (پروفیسر حامدی کاشمیری)منتخب افسانے عجائب گھر کا طوطا،عزت+ نفرت+ محبت= بدلہ،قاتل۔۔۔مقتول،اصلی مجرم کو پیش کرو،اپنا عکس اپنا اائینہ،انتظار اور میں (ان تمام کے تجزیے (جاوید انور)۔شمارہ ۳۰ میں کرچیوں کا سفر (وحشی سعید) صلیب ذات (خالد حسین) مجرم قافلے کی داستان (نور شاہ)اور طلسم ٹوٹ گیا (ڈاکٹر رینو بہل) میں جھک کے بھی ۔۔۔(کہکشاں انجم) سزا (ایثار کاشمیری)۔

شمارہ ۳۱ میں لمبے قد کا بونا (مشتاق احمد نوری، پٹنہ)اس افسانے کا تجزیہ (شکیل الرحمن)جنت والی چابی (ڈاکٹر ریاض توحیدی) افسانے کا تجزیہ (ڈاکٹر بشارت خاں، پاکستان)عورت اور مچھلی (وحشی سعید) حرص کا سفر (خالد حسین) دوزخ (یٰسین احمد) سنیچر کا کرب (ایم ۔اے ۔کنول جعفری) چارہ گر (ڈاکٹر رینو بہل)ایک سوال،فرق ۔احساس،تم پاگل ہو (افسانچے کہکشاں انجم)۔

شمارہ ۳۲ میں کھنڈر ضمیر (خالد حسین) میراث (ڈاکٹر ریاض توحیدی) جنازہ (محمد الیاس انجم نوشہری،نوشہرہ)ایک اٹل حقیقت (ناظرہ بنت یوسف سیہ،لنگیٹ) شمارہ ۳۳ کا ریکارڈ موجود نہیں ہے ۔شمارہ ۳۴ میں صرف ایک افسانہ 'خوابوں کی شہزادی' ہلال احمد شاہ،سرینگر) شمارہ ۳۵ میں دانا (اسلم جمشید پوری) گئو رکشک (افسانچہ خالد حسین)۔شمارہ ۳۶ میں کوئی افسانہ شامل نہیں تھا۔شمارہ ۳۷ اور ۳۸ کا ریکارڈ موجود نہیں ۔شمارہ ۳۹ میں اپنی شہ رگ (ڈاکٹر ریاض توحیدی)اڑن تشتری (طارق شبنم، بانڈی پورہ)میں شرمندہ ہوں (محمد ارشد کسانہ ،سورنکوٹ)وادئ پرسان (افسانچہ،محمد الیاس مضمر، دراس،لداخ)۔شمارہ ۴۰ میں ہم کتنے شرمندہ ہوئے (ڈاکٹر ایم ۔عاشق رضا،سورنکوٹ) زوجیلا کی آغوش میں (الیاس مضمر)۔شمارہ ۴۱ اور ۴۲ میں کوئی افسانہ شامل نہیں ہے ۔شمارہ ۴۳ میں کپڑے والا (ڈاکٹر ریاض احمد ڈار، بڈگام)امیدیں دفن ہوگئیں (غلام مہدی شاہد منجی، کرگل)۔شمارہ ۴۴ میں کوئی شمارہ شامل نہیں ۔شمارہ ۴۵ میں پیار کی روشنی (خالد حسین) سفید داغ (وفا نقوی، علی گڑھ)۔شمارہ ۴۶ اور ۴۷ میں کوئی افسانہ شامل نہیں ہے۔

جیسا کہ واضح ہے کہ ۲۰۰۸ء سے ۲۰۲۰ء کے اب تک کے سفر میں کسی کسی شمارہ میں افسانے شائع ہی نہیں ہوئے ۔اس کی کئی وجوہات ہیں ۔سب سے بڑی وجہ تحریک ادب کے اصول و قوانین ہیں ۔اصول یہ ہے کہ اس میں اشاعت کے لئے تحریک ادب کا رکن بننا لازمی ہے اور جس کی

سالانہ فیس ہے۔اگر ایک سال مکمل ہونے کے بعد ایک شمارہ ارسال کرنے اور یاددہانی کے باوجود تجدید خریداری کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملتی تو رسالہ نہیں بھیجا جاتا۔ظاہر ہے غیر سرکاری اداروں کے لئے رسالہ چلانے کی اور کوئی صورت نہیں اور خریداروں میں ایسے لوگوں کی بھی تعداد وافر ہے جو ایک بارزر سالانہ دے کر سمجھتے ہیں کہ رسالہ ان کو تا حیات جاری رہے گا۔میں نے اس پر سختی سے عمل کیا اور میرے خیال میں شاید یہی سب سے بڑا سبب ہے کہ تحریک ادب اپنی اشاعت کے ۱۳ ویں سال میں داخل ہو گیا ہے، ورنہ کئی ایسے رسالے ہیں جو اعلیٰ معیاری ہوتے ہوئے بھی دم توڑ چکے ہیں یا وقت پر نہیں نکل پاتے۔

رہا معاملہ معیار کا تو اس پر بھی تحریک ادب پورا اترتا ہے۔افسانوں اور دیگر اصناف سخن کے تعلق سے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ تحریک ادب کا ایک مقصد نئے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ ان فنکاروں کو ادبی منظر پر لانا ہے جو کسی بنا پر اہل ادب سے پوشیدہ رہے یا ان کی شناخت اس طرح نہیں بن پائی جس کے وہ مستحق تھے۔یا پھر جو مصروفیت کے سبب یا کسی اور بنا پر فکشن سے وہ مستحکم ربط نہیں رکھ پاتے تھے جو کہ ادب کا حق تھا۔وحشی سعید اس کی بین مثال ہیں۔اسی طرح کشمیر سے لے کر لداخ تک کے کئی تخلیق کار ہیں جو پہلی مرتبہ تحریک ادب میں شائع ہوئے۔اسی طرح ملک کے دوسرے صوبوں کے فنکار بھی پہلی بار تحریک ادب میں شائع ہوئے اور ان کی ادبی شناخت کے تعین میں تحریک ادب کا کردار بہت اہم رہا۔غیر ممالک کے بھی کئی فکشن نگار تحریک ادب کی زینت بنے جن کا ذکر شماروں کی فہرست میں آچکا ہے۔

زیادہ تر غیر سرکاری رسائل میں افسانوں کی اشاعت اب عنقا ہوتی جارہی ہے۔اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں،لیکن میرے خیال میں اب بیشتر معتبر افسانہ نگاروں کا رویہ سرکاری رسائل کو ترجیح دینا ہو گیا ہے۔وہاں سے پیسے بھی مل جاتے ہیں جبکہ غیر سرکاری میں سالانہ خریداری کے طور پر پیسے جاتے ہیں اور سوائے رسالے اور تعریفوں کے کچھ نہیں ملتا۔ایک معتبر افسانہ نگار اگر ایک سال میں ۱۰ افسانے بھی تخلیق کرتا ہے تو ہندوستان میں دس سے زاید سرکاری رسالے نکلتے ہیں۔تو اس طرح اس کا دوسری کتابوں کے خریدنے کا خرچ تو نکل ہی آتا ہے،لیکن اس کا خمیازہ سرکاری رسائل کو بھگتنا پڑتا ہے کہ اس کے نعم البدل کے طور پر ان کے پاس اردو ادب کے بڑے مغفور افسانہ نگاروں کے

افسانے رہ جاتے ہیں یا پھر ہندی، انگریزی یا دیگر زبانوں کے ترجمہ کردہ افسانے۔صف اول کے بعد دوئم سوئم افسانہ نگاروں کی تو ایک بھیڑ ہے لیکن ان کے ارسال کئے ہوئے افسانوں کو پڑھنا اور ان میں سے معیاری افسانوں کا انتخاب بڑے دل گردے کا کام ہے اور پھر اس کے لئے وہ انتخابی نظر بھی چاہئے جو اس کا حق ادا کر سکے۔تحریک ادب میں اسی لئے مواد کی حصولیابی، غیر مما لک اور ملک کے دور دراز علاقوں مثلاً لداخ کے لیہہ، کرگل اور دراس وغیرہ، جموں و کشمیر اور دوسرے صوبوں کے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اور ان افسانہ نگاروں کی تخلیقات جو کہ اردو فکشن کے اعلیٰ معیار میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں، ان تمام کو ملحوظ رکھتے ہوئے افسانوی خدمات انجام دی جا رہی ہیں ۔

☆☆☆

Dabistan-e-Himala,dhunak aur Farooq Muztar by Dr. Jawed Ahmad

(Varanasi) cell-9935957330, **ڈاکٹر جاوید احمد** (وارانسی)

دبستان ہمالہ، دھنک اور فاروق مضطر

فاروق مضطر شہر راجوری جموں و کشمیر، خطۂ پیر پنچال کی شاید وہ واحد شخصیت ہیں جو اپنے علم، اپنی دولت اور اپنے رسوخ کا استعمال اردو زبان و ادب سمیت زندگی کے تمام شعبہ ہائے علوم کی فلاح و بہبود اور آبیاری کے لئے کرتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ تب سے جاری و ساری ہے جب ان کے پاس صرف علم تھا، دولت اور رسوخ نہ تھا۔ یہ وہ دور تھا کہ اگر نئے کپڑے اور اہم کتابوں کی اشد ضرورت ہو اور ان میں انتخاب کرنا ہو تو فاروق مضطر کتاب خریدنے کو ترجیح دیتے تھے اور پرانے کپڑوں سے کام چلاتے تھے۔ اسی دوران انہوں نے ۱۹۷۳ء میں ایک ادبی جریدہ ''دھنک'' کے نام سے جاری کیا۔ جس کی اشاعت کچھ ہی وقتوں تک قائم رہ سکی۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ فاروق مضطر ''دھنک'' جاری نہیں رکھ سکتے تھے، بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ان کی اضطرابی صفت نے ''دھنک'' کے توسط سے خطہ پیر پنچال کی مکمل تعلیمی صورت حال کا احاطہ کرلیا جس کا فروغ ان دنوں ''دھنک'' کے توسط سے ادب کی خدمت سے اہم اس علاقے کی تعلیمی خدمات کا متقاضی تھا۔ ''دھنک'' سے اردو کی آبیاری مقصود تھی اور تعلیمی ادارہ قائم کرنے کا مقصد نسلوں کی آبیاری تھا، جس کے لئے ''دھنک'' میں صرف ہونے والا وقت بھی درکار تھا۔ فاروق مضطر نے اس اہمیت اور ضرورت کو سمجھتے ہوئے خود کے تمام اوقات کو اسی عظیم مقصد کے لئے وقف کر دیا اور آج ان کی کاوشوں کا ثمر کئی تعلیمی اداروں کی شکل میں راجوری اور اس کے قرب و جوار میں خطہ پیر پنچال کی کئی نسلوں کی زندگی سنوارتے ہوئے آگے کے مراحل طے کر رہا ہے۔

میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ میرے خیال میں اگر فاروق مضطر ادیب و شاعر نہ ہوتے، صحافی نہ ہوتے تو شاید اس عظیم مقصد کی حصولیابی اس طور نہ ہوتی۔ ان کا اضطرابی اور ''تازہ ویرانے کی سودائے محبت کو تلاش'' والا ذہن جو یقیناً ان کی ادبی خلاقیت کا مرہون منت ہے، کا اس ضمن میں سب سے اہم کردار ہے۔ ''دھنک'' کی اشاعت ملتوی تو ہوگئی لیکن مضطر صاحب کے ادبی

خدمات کے ارادے ملتوی نہیں ہوئے۔ اپنے ذاتی صرفہ سے سال میں کئی کئی ادبی تقریبات، ادبی کتب کی اشاعت، ادیبوں کو اعزاز وغیرہ کا سلسلہ تو نہ جانے کب سے ہے، ادھر کچھ عرصے سے ''دبستانِ ہمالہ'' کی صورت میں منفرد ادبی مجلّے کی اشاعت نے اپنے مواد کے اعتبار سے تمام شعبہ تعلیم سے تعلق رکھنے والے اہل اردو جن میں ادب سے وابستہ افراد بھی ہیں، کے علاوہ انگریزی زبان کے عالموں اور اس زبان سے شغف رکھنے والوں کو بھی اپنی جانب منعطف کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پچھلے سال سے ''دھنک'' کی ازسرنو اشاعت کا سلسلہ جہاں ان کے ادبی ذوق کے سالم رہنے اور اس کی تسکین کے عملی رویوں کی جانب ذہن کو منتقل کرتا ہے وہیں یہ سوال بھی ذہن میں آتا ہے کہ کیا محض اپنی ادبی تسکین کے لئے ''دھنک'' کی اشاعت کی ازسرنو ابتداً کی گئی ہے یا اس میں اس دور میں جو مواد شائع ہوتا تھا، یعنی آج سے ۵۰ سال قبل، اس کی نصف صدی کے بعد بھی کوئی قدرومنزلت باقی رہی ہے۔؟ یا ان کے امکانات مستقبل قریب میں بھی کسی طور ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں؟

ان تمام کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر ''دھنک'' کے پہلے شمارے کی مشمولات پر غور کیا جائے جو کہ ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا تھا، میں عادل منصوری، بلراج کومل، عمیق حنفی، نشتر خانقاہی، مظفر حنفی، جوگندر پال، کرشن کمار طور، غلام مرتضیٰ راہی، شمس الرحمن فاروقی، ظفر صہبائی، صلاح الدین پرویز، عرش صہبائی، عابد مناوری، نور شاہ، حامدی کاشمیری، حکیم منظور، ہمدم کاشمیری، ظہور الدین، شجاع سلطان، آنند لہر، مظفر ایرج، خالد حسین، فاروق نازکی، عابدہ احمد، یٰسین بیگ، پرتپال سنگھ بیتاب، احمد شناس، مسعود سامون، شہباز راجوروی، بلراج بخشی، خورشید بسمل، صابر مرزا، مصور سبزواری اور خود فاروق مضطر کی ایک غزل شامل ہے۔

نظموں، غزلوں پر غور کیا جائے تو یہ اپنے دور کے جدیدیت کے رجحان کی نمائندگی کرنے کے ساتھ ساتھ آج کے عہد سے کس قدر منسلک ہیں، ان کے مطالعے سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ تمام فنکار جو اس میں شامل ہیں، ان کی تخلیقات کو کسی محدود عہد میں مقید کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ دلیل کے طور پر اگر اس وقت کا فاروق مضطر کا اداریہ ہی دیکھا جائے:

''اردو میں تو خرید کر پڑھنے والوں کی تعداد مایوس کن ہے۔ ایسے حالات میں کسی ادبی، علمی جریدے کا اجراء دیوانے کا خواب لگتا ہے اور ہم اس کے باوجود ''دھنک'' کے اجراء کا تجربہ کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تجربہ جبھی کامیاب ہو سکتا ہے جب اصحاب ذوق اور علم دوست حضرات ''دھنک'' کو معیاری مضامین و تخلیقات سے تعاون دیں۔

اس سلسلے میں ہمیں حسب خواہش تعاون نہیں ملا۔اردو رسائل و جرائد کا المیہ یہ بھی ہے کہ اہم لکھنے والے عام طور پر ایسے رسائل میں چھپنا پسند کرتے ہیں جن کی سر پرستی وارث علوی کی زبان میں ''علم و ادب کے بڑے بھائی لوگ'' کرتے ہوں۔ تاہم جہاں کہیں کسی مدیر کی خواہش ہو کہ وہ اپنے جریدے کو خوب سے خوب تر بنائے، وہاں لکھنے والوں کا بھی فرض ہے کہ وہ معیاری مضامین و تخلیقات سے تعاون دیں۔

اس سلسلہ میں ہم نے ''دھنک'' کا مزاج ومعیار متعین کرنے کے لئے دوسرے رسائل و جرائد یا کتابوں سے چند معیاری نگارشات اخذ کی ہیں،اس سے ہمارا مقصد یہی ہے کہ ''دھنک'' بلند ذوق قارئین کو متوجہ کر سکے۔

''دھنک'' کے اجراء سے ہمارا بنیادی مقصد ریاست جموں و کشمیر میں ادب وفن میں نئے نئے رجحانات ومیلانات سے علم دوستو اور ادب پسندوں کو باخبر رکھنا اور تحریک وترغیب دینا ہے۔لہٰذا ان مسائل پر بحث وتمحیص کے لئے ''دھنک'' کے صفحات وقف ہیں۔مگر ادب شرط ہے۔مختلف رسائل و اخبارات میں ''دھنک'' کو ''سنگ میل'' کے نام کے تحت مشتہر کیا گیا تھا لیکن بعض وجوہ سے بعد میں اسے ''دھنک'' کرنا پڑا۔قارئین اور قلمکار حضرات نوٹ فرمالیں۔''

غور کیا جائے تو ادارئے کی بیشتر باتیں زمانے کی تغیر پذیری کے ساتھ اپنی اضافی صورت میں آج بھی موجود ہیں۔آج بھی مسئلہ رسالہ اور کتاب خرید کر پڑھنے کا جوں کا توں ہے۔سوشل میڈیا نے پی ڈی ایف کاپی یا اردو ان پیج فائل کی سہولت تو عطا کی ہیں جن کو موبائل میں ڈاؤن لوڈ کر کے پڑھا جاسکتا ہے لیکن اس سے آنکھوں پر بہت مضر اثر ہوتا ہے۔

یعنی ہر صورت میں کتاب آج بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی پہلے تھی اور آج بھی کتب و رسائل کی خریداری کا مسئلہ بنا ہوا ہے۔اس کے ساتھ ہی معیاری تحریروں کی اشاعت کے لئے کسی ''بڑے بھائی کا رسالہ'' تو اب شاید موجود نہیں ہے لیکن اس رویے میں فقط اتنی تبدیلی آئی ہے کہ اس قسم کی تحریروں کو ان سرکاری رسائل میں اشاعت کے لئے ارسال کیا جاتا ہے جہاں سے کچھ رقم حاصل ہو سکے۔ظاہر ہے کہ اس سے غیر سرکاری رسائل کے معیار ووقار پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں ،اندازہ کیا جاسکتا ہے۔اس طرح غور کیا جائے تو دوسرے کتب ورسائل میں شامل اہم تحاریر کو اپنے رسالے میں شائع کرنا جہاں اس دور کی ایک اہم ضرورت تھا، وہیں آج بھی ہے۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ''دھنک'' کے سرورق'' پر جو یہ تحریر درج ہے کہ:''معیار واقدار کا نیا میزان'' وہ بالکل درست

ہے۔ یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ''دھنک'' اپنے پہلے زمانے میں نئے رجحان کی نمائندگی کرنے والا خطہ ء پیر پنچال کا پہلا اور واحد رسالہ تھا،آج بھی اس کی مشمولات آج کے زمانے کی اعلیٰ معیاری تحریروں میں بلا کسی مبالغے کے شامل ہیں۔علاوہ تخلیقی ادب کے اگر تنقیدی مضامین پر ہی غور کر لیں تو بلراج کومل کا مضمون ''جدید ادب: ایک رویہ'' آج بھی اپنے آفاقی خیالات کے سبب وہی اہمیت رکھتا ہے بلکہ آج علم کے زوال کے دور میں اس کی قدر میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔شمس الرحمن فاروقی کے غالب کے ایک شعر کی تفہیم اور حامدی کاشمیری کا مضمون ''نئی حسیت کا مفہوم'' ایسے شاہکار ہیں جو آج بھی ہمارے لئے مشعل راہ ہیں۔اس طرح یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ''دھنک'' کی اپنے ۱۹۷۳ کے مواد کے ساتھ از سر نو اشاعت کوئی جذباتی عمل نہیں ہے بلکہ نئی نسل کو تخلیقی تحقیقی اور تنقیدی سطح پر ان اسلوبیات سے روشناس کرانا ہے جن کا جاننا آج کے طالب علم اور نئے ادیبوں کے لئے لازمی ہے۔

''دھنک'' کے دوسرے شمارے کی مشمولات پر نظر ڈالنے سے قبل اس کے اداریے میں شامل یہ سطور بھی بڑی اہم معلوم ہوتی ہیں:

''۱۔تحقیقی مقالات اور جدید شعر و افسانہ کے مسائل پر مضامین ترجیحاً شائع ہوں گے۔

۲۔افسانے اور تخلیقات ہمارے مزاج و معیار کے مطابق ہوں۔

۳۔نوجوان شعرا اپنی پانچ نمائندہ تخلیقات ہمیں بھیجیں تاکہ مزاج و معیار کا اندازہ ہو سکے۔

۴۔رزم و بزم کے تحت صرف وہی خطوط شائع ہو سکیں گے جن میں پچھلے شمارہ کے مشمولات کے خوب و ناخوب سے تفصیلی بحث ہو۔سرسری تبصرے اور رسمی تعریف و توصیف کے حامل خطوط شامل اشاعت نہ ہو سکیں گے۔''

اس شمارے کی مشمولات پر غور کریں تو راج نارائن راز،جگن ناتھ آزاد،عتیق اللہ،مظہر امام،رحمن راہی، نصر قریشی،نصیر پرواز،قاضی عبید الرحمن ہاشمی، اسعد بدایونی،رفیق راز،عابد پیشاوری،ظہیر غازیپوری،یوسف جمال،وحشی سعید،ابن فرید،اختر یوسف،سلام بن رزاق،ایاز رسول نازکی،رخسانہ جبین،وریندر پٹواری،منظر اعظمی،عشرت کاشمیری،محمد ایوب شبنم،مشتاق فریدی،نثار احمد صدیقی،اقبال نازش،رشید قمر،ڈی کے کنول،اور فاروق مضطر کا ''نئے کلاسیک۔مرتبین: بشر نواز، جوگندر پال،قاضی سلیم'' پر ایک تبصرہ شامل ہے۔

اس شمارے میں بھی تحقیقی مقالات اور جدید شعر و افسانہ کے مسائل پر جو مضامین شامل

ہیں، وہ کسی مخصوص عہد کے لئے اختصاص نہیں رکھتے بلکہ ان میں وہ نکات بیان کئے گئے ہیں جن سے ہر تخلیق کار کا ہر دور میں واسطہ پڑتا ہے۔جگن ناتھ آزاد کا مضمون ''اردو شاعری میں فکر اور جذبے کی کشمکش'' کا دوسرا پیراگراف ملاحظہ ہو۔

''عظیم ادب کے بارے میں کالرج نے کہا ہے کہ عظیم فکر کے بغیر اس کی تخلیق ممکن نہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تنہا فکر ہی کسی نثر پارے یا نظم کو ادب العالیہ کے مقام نہیں دے سکتا۔اونچا خیال یا گہرا تفکر جب تک جذبے میں نہیں جاتا، اس وقت تک ادب العالیہ کی تخلیق کا مقصد اس سے دور رہتا ہے۔غالب اور اقبال کی شاعری ہو یا پریم چند، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی کے افسانے ہوں یا محمد حسین آزاد اور ابوالکلام آزاد کی نثر ہو، ان سب کے تجزیے سے یہی بات سامنے آتی ہے کہ فکر کی شدت نے انجام کار جذبے کا روپ اختیار کیا ہے تو یہ فن پارے معرض وجود میں آئے ہیں۔''

کیا مندرجہ بالا اقتباس کسی خاص عہد کے خانے میں محدود کیا جا سکتا ہے؟ کیا اس کی قدر و قیمت اور اہمیت اس طور مسلم نہیں ہے کہ یہ موجودہ اور آنے والے زمانے کے تخلیق کاروں کے لئے بھی مشعل راہ ہے؟ ''دھنک'' کی از سر نو اشاعت کے جواز کی صورت میں اس شمارے میں شامل دوسرا مضمون ''ہندوستانی سماج کی تشکیل نو میں ادب کا حصہ'' جو رحمن راہی کا ہے، پیش کیا جا سکتا ہے۔اس کی ابتداء یوں ہوتی ہے:

''ہندوستانی سماج کی آجکل جو نئی تشکیل ہو رہی ہے، اس کا عمل بڑا پیچیدہ ہے۔یہ عمل بیک وقت شکست و ریخت کا بھی ہے اور تعمیر و تزئین کا بھی۔نئے سماج کے معماروں کے سامنے دو طرح کے مسائل ہیں، ایک وہ جو اس جاگیرداری نظام کی پیداوار ہیں، جسے انگریزی سامراج جاتی دفعہ نیم مردہ حالت میں چھوڑ گئے تھے اور دوسرے وہ جو مستقبل سے متعلق اشتراکی نصب العین کے گویا قدرتی تقاضے ہیں۔''

غور کیا جائے تو آج کے سماج کی تشکیل کی بھی کیا وہی نوعیت نہیں ہے جس کا رحمن راہی صاحب نے اس دور میں ذکر کیا ہے۔جاگیرداری نظام جو اس وقت نیم مردہ حالت میں تھا اور اشتراکیت کے درمیان سماجی کشمکش کیا اب بھی نہیں ہے؟ تغیر پذیری جو وقت اور زمانے کے آگے بڑھنے کا لازمی جزو ہے، کے آئینے میں بھی غور کریں تو بنیادی مسائل اب بھی وہی ہیں جو رحمن راہی کے مضمون کا موضوع ہیں۔اسی طرح قاضی عبید الرحمن ہاشمی کا مضمون ''شعری منطق اور عصریت: بحوالہ اقبال'' بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے کسی بھی زمانی قیود کو قبول نہیں کرتا۔مضمون کی ابتدائی

سطریں ہی اس کی وضاحت کر دیتی ہیں۔

''حقیقی فنکاری کا مدعا ابدیت کی تشکیل بھی ہے اور ابدی صداقتوں کے سرچشموں کی جستجو اور اثبات بھی۔ ادب زماں کی کسی بھی حالت ماضی، حال یا مستقبل کے دائروں یا ساعتوں کا پابند نہیں ہو سکتا۔ یہ حدود اس کے امکانات کی وسعتوں کے لئے نہ صرف ناکافی بلکہ نقصان دہ بھی ہیں۔ اس کی حسیت دوامی حال ہی کے تناظر میں سمجھی جا سکتی ہے۔''

غرض ''دھنک'' کے اس دوسرے شمارے کی مشمولات بھی موضوع و مواد کے اعتبار سے ایسے نہیں ہیں کہ جن کا تعلق آج کے غالب موضوع یا غالب رجحان سے نہ ہو۔ یہ مواد اس دور میں جتنے کارآمد تھے اب اس سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اس سلسلے میں عابد پیشاوری کا مضمون بہ عنوان ''یونیورسٹیوں میں تحقیق کا معیار'' جو ۱۹۷۴ء کے پہلے کی تحریر ہے، آج کی صورت حال کی کس قدر حقیقی نمائندگی کرتا ہے، اس کے مطالعے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ نثار احمد صدیقی کا انٹرویو 'جدیدیت کیا ہے؟ جمیلہ شاہین، گوپی چند نارنگ اور وہاب اشرفی'' اس رجحان کی بنیاد کو سمجھنے اور عصر حاضر میں جدیدیت کی خوبی و خامی کے تعین میں بہت اہم ہے۔ فاروق مضطر کا ''نئے کلاسیک'' پر تبصرہ بھی اس کتاب کی آج کی اہمیت پر دال ہے۔ ان دو شماروں کی روشنی میں پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ''دھنک'' کے وہ چند شمارے جو اس دور میں شائع ہوئے، آج کے عہد میں از سر نو اشاعت کا نہ صرف اپنا ایک مستحکم جواز رکھتے ہیں بلکہ آج کی اردو دنیا کی ایک اہم ضرورت بھی ہیں کہ نئے ذہن اس سے روشنی حاصل کریں کہ اعلیٰ معیاری تحریریں کیا ہوتی ہیں، کس طرح ان کا انتخاب کر کے ایک رسالہ ترتیب دیا جاتا ہے کہ اس کی اہمیت اور انفرادیت آئندہ زمانوں تک باقی رہتی ہے۔

''دبستان ہمالہ'' ہمالین ایجوکیشن مشن سوسائٹی کا ایک ایسا سہ ماہی رسالہ ہے جسے اس کی نوعیت کے اعتبار سے ہندوستان، پاکستان اور بیرون ممالک میں موجود پوری اردو دنیا کی تاریخ میں اب تک کا پہلا ایسا رسالہ تسلیم کیا جا سکتا ہے جس میں تمام اہم شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی شاہکار شخصیات، ان کی تحاریر اور ان پر لکھی گئی تحاریر کو اس مجلّے کے احاطے میں سمیٹ لیا گیا ہے۔ اس کی اشاعت کا جو مقصد ہے وہ اس کے سر ورق پر عبارت سے واضح ہو جاتا ہے کہ ''تہذیبی، ثقافتی، علمی، ادبی، تعلیمی، تعمیری مجلہ'' اور ''گنگا جمنی تہذیبی روایت کا امین و انسانیت کا علمبردار''۔ اس کے شمارہ ۶، اپریل تا جون ۲۰۲۳ء کا مطالعہ کیا جائے تو اے ۴ سائز کے اس مجلّے کے سرورق پر جو تصاویر ہیں وہ مولانا وحید الدین خاں، خان عبدالغفار خان، پروفیسر گوپی چند نارنگ

اور پروفیسر رحمن راہی کی ہیں۔ پشت ورق پر گرونا نک دیو جی، لال بہادر شاستری اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی تصاویر ہیں۔ ۶۴ صفحات کے اس شمارے میں ۱۶ صفحات انگریزی میں بھی ہیں لیکن ایسا نہیں ہے کہ یہ باقی ۴۸ صفحات جو اردو میں ہیں، ان میں سے کسی ۱۶ صفحات کے اردو مواد کا انگریزی میں ترجمہ ہے بلکہ انگریزی کے اس حصہ کی اپنی انفرادیت ہے۔ اس سے گمان غالب ہے کہ آئندہ کے کسی شمارے یا شماروں میں ہندی کے لئے بھی کچھ صفحات مختص کئے جائیں۔ اس شمارے کے اردو اور انگریزی حصہ میں شامل مشمولات کی فہرست پر ہی غور کر لیا جائے تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس مجلّے کے مقصد کے تعلق سے جو تحریر سرورق پر درج ہے یعنی کہ ''تہذیبی، ثقافتی، علمی، ادبی، تعلیمی، تعمیری مجلہ'' اور ''گنگا جمنی تہذیبی روایت کا امین وانسانیت کا علمبردار'' تو اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ خدمات کے سلسلے میں مزید اضافہ کرتے ہوئے مختلف ادبی اور ثقافتی پروگراموں نیز مختلف ادبی، ثقافتی اور سیاسی وغیرہ شخصیات کی خدمات کے اعتراف میں اعزازی تقریبات کا اہتمام اور ان کو مختلف ایوارڈ سے سرفراز کرنا ایسا عمل ہے جو یہ باور کراتا ہے کہ فاروق مضطر کی نظر زندگی کے ہر شعبہ اور بالخصوص خطہء پیر پنچال کی زندگی کے ہر شعبہ پر گہری ہے اور وہ مختلف طریقوں سے اس خطہ میں تعلیمی، تہذیبی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے فروغ میں خود کی زندگی کو وقف کئے ہوئے ہیں۔ اسی لئے انہیں خطہء پیر پنچال کا سرسید کہا جاتا ہے جو بلا مبالغہ سو فی صد درست ہے۔ اس سلسلے میں سرسید احمد خاں کی کارکردگی اور فاروق مضطر کی کارکردگی کا مختصر ذکر لازمی ہو جاتا ہے۔

۱۔ سرسید نے قوم کی تعلیمی بدحالی کو ملکی پیمانے پر دیکھا اور چونکہ وہ خود اعلیٰ خاندان جو ہر طرح سے فارغ البال تھا، دھن دولت عیش وعشرت کی کوئی کمی نہ تھی، کے فرزند تھے اور خود اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور بنارس شہر اور ملک کے دوسرے ایسے مقامات سے اپنی سرگرمیوں کی ابتدا کی جو مرکز میں تھے۔ ان کو پورے ملک کے بڑے بڑے نوابین، رئیسوں اور انگریزوں تک کا ساتھ ملا، مالی تعاون ملا اور ملتا رہا جس سے علی گڑھ میں ایک اسکول کا قیام اور بعد میں اس کی یونیورسٹی کی صورت۔ اس کے لئے انہوں نے پورے ہندوستان جس میں غیر منقسم پاکستان بھی شامل ہے، کے کتنے دورے کئے ہم سب جانتے ہیں۔ فاروق مضطر جنہوں نے ایک تقریباً مفلس گھر میں جنم لیا اور اپنے خطہء کی تعلیمی بدحالی پر غور کرتے ہوئے سب سے پہلی بڑی قربانی یہ دی کہ اپنا سب سے پسندیدہ مشغلہ یعنی ادب کی تخلیقیت کو عرصہ دراز کے ملتوی کر دیا اور ایک کرائے کے کمرے سے پرائمری کلاس کے ساتھ تعلیم وتربیت کا سلسلہ شروع کیا۔ اس میں ان کے ساتھ ان کے والد تھے جو خود ہائی اسکول تک کے ایک استاد تھے اور

اس زمانے میں مدرس کی تنخواہ کتنی ہوتی تھی، ہم سب اس سے واقف ہیں۔یعنی جس طرح سرسید کو مالی تعاون حاصل ہوا، فاروق مضطر اس سے پوری طرح مرحوم رہے،لیکن مشن ان کا بھی اپنے خطہ کی محدودیت تک جہاں ہر قسم کی پس ماندگی اور آمدورفتکی دشواریاں اپنے عروج پر تھیں، وہی تھا جو سرسید کا ملکی سطح پر مرکز میں رہ کر تھا۔ان کے مسائل جدا تھے، انہوں نے بہت لکھا بھی، اخبارات ورسائل بھی شائع کئے،لیکن فاروق مضطر کا علاقہ مرکز سے بالکل کٹا ہوا ایسا دشوار گزار پہاڑی علاقہ اب بھی ہے کہ بہت سی آج کی جدید سہولتوں کے باوجود اکثر برفباری کے دنوں میں یا موسم کی خرابی کے دنوں میں پورے ملک سے تقریباً کٹ جاتا ہے۔نہایت مفلس خطہ جو ہر طرح سے اس دور میں پس ماندہ تھا اورٹرین کی سہولت تو اب تک نہیں ہے،اس دور میں بجلی پانی اور سڑک جیسی بنیادی سہولیات اور روزگار کے امکانات کتنے رہے ہوں گے،اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔اس پر یہ بھی کہ ایک عرصہ تک ملی ٹینسی کا دوراوران سب سے جوجھتے ہوئے نئی نسلوں کوتعلیم کی اہمیت سے روشناس کرانے اور خطہ پیر پنچال کی قوم کے فروغ میں اہم کردار ادا کرنا اور ایک چھوٹے سے اسکول کو کئی تعلیمی اداروں اور ڈگری کالجوں میں تبدیل کردینا کسی بھی طرح سرسید کے ایک اسکول کو یونیورسٹی میں تبدیل کردینے سے کم نہیں ہے۔

۲۔سرسید نے جو اخبارات ورسائل جاری کئے،ان کے لئے مالی تعاون دینے والوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔فاروق مضطر نے جو بھی کیا اسی کالج کی فیس سے پیسوں کو بچا کر کیا۔سرسید کے رسائل وجرائد جو بار بار بند ہوئے اور پھر جاری ہوئے، وہ سب انگریز حکومت کی مہربانی تھی۔جب بھی انہوں نے نشرواشاعت کا عمل شروع کیا،ان کو مالی تعاون دینے والے موجود تھے۔اس کے علاوہ ان کے پاس ایسے رفقاء کی پوری ایک صف موجود تھی جو سرسید کے مشن کو آگے بڑھانے میں پیش پیش تھے۔یہاں فاروق مضطر اپنے اہل خانہ یعنی والد اور بچوں کے ساتھ تنہا تھے،پھر بھی وہ اپنے خطہ پیر پنچال کی علاقائی سطح پر اسی طرح کامیاب ہوئے جس طرح سرسید ملکی سطح پر۔

۳۔سرسید اپنی یونیورسٹی میں یا اس سے قبل کہیں بھی کسی تقریب کا اہتمام کرتے تھے تو لوگ اس کا خرچ برداشت کرنے لئے موجود تھے یا وہ وسائل موجود تھے جن میں حکومتی سطح پر یونیورسٹی کے لئے ملنے والے بجٹ کی سہولت بھی تھی۔یہاں فاروق مضطر جو بھی پروگرام کرتے ہیں وہ خود کے ذاتی صرفہ سے انجام پاتا ہے۔اکیڈمی جیسے سرکاری ادارے کے اشتراک سے جو پروگرام ہوتے ہیں،ان میں اکیڈمی کی مخصوص اور محدود جاری شدہ رقم ہوتی ہے اور فاروق مضطر کا اشرتاک اس پروگرام میں اکیڈمی

کے اضافی خرچ کو بانٹتا ہے نہ کہ اکیڈمی کے تعاون سے فاروق مضطر کے ادارے کا خرچ کم ہوتا ہے۔
اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں اور فاروق مضطر کو خطہء پیر پنچال کا سر سید تسلیم کرنے کے سلسلے میں شواہد کے طور پر ایک لمبے عرصہ تک کی ان کی خدمات پر گفتگو کے لئے، کئی صفحات کا الگ مضمون درکار ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اتنے سے بھی کسی شک وشبہ کی گنجائش اب باقی نہ ہوگی کہ فاروق مضطر کو خطہ پیر پنچال کا سر سید کیوں تسلیم کیا جاتا ہے۔

☆☆☆

Firaq Gorakhpuri ki Nazm nigari by Shahnavaj Ansari (Research Scholar dept. of Urdu ,BHU, Varanasi)cell-7068530985

شاہنواز انصاری (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی)

فراقؔ گورکھپوری کی نظم نگاری

فراق گورکھپوری اردو ادب کے بے حد مقبول شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ وہ اردو کے نظمیہ شاعری میں اپنا منفرد اور امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ فراق کی شاعری اپنے عہد کی بہترین آواز کہی جاتی ہے۔ اردو کی عشقیہ شاعری ہو یا اردو شاعری میں ہندوستانی تہذیب وتمدن کی عکاسی ، ہر مقام پر فراق اپنے میدان میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ فراق ہندوستانی تہذیب کے علمبر دار ہیں ان کی شاعری میں ہمیں ہندوستانی فکر و فلسفہ جا بجا دکھائی دیتا ہے۔ اردو شاعری میں میر و غالب اور پھر اقبال کو اہم مقام حاصل ہے۔ ان شاعروں کے بعد کے شاعروں کی اگر بات کی جائے تو ان میں فراق ،فیض اور جوش کے نام آتے ہیں۔ ان شاعروں کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ ان سبھی نے غزل کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی کہی ہیں۔ فراق اردو شاعری میں بطور غزل گو شاعر مقبول رہے ہیں۔ فراق نے اپنی شاعری میں عشق و رومان کا نیا باب وضع کیا ہے۔ ان کے صنم خانہ عشق میں ہندو دیو مالائی عناصر اور انگریزی شاعری کے اثرات بیک وقت ملتے ہیں۔

فراق یوں تو غزل کے شاعر ہیں اور ان کی مقبولیت کی وجہ غزل رہی ہے لیکن فراق کی کچھ نظمیں بہت مشہور رہی ہیں۔ اردو کی نظمیہ شاعری کی بات ہوتی ہے کہ فراق کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اس شاعر نے داستانِ ادم ، ادھی رات ، جگنو ، ہنڈولا ، عشق اور موت ، پرچھائیاں ، دھرتی کی کروٹ ، جدائی ، روٹیاں ، قیدی جیسی شہرآفاق نظمیں لکھی ہیں۔ فراق ، نظیر ، اکبر ، اقبال ، چکبست ، انیس ، حالی ، اور اختر شیرانی جیسے شعرا سے متاثر رہے ہیں۔ ان کی نظموں میں ان شاعروں کا عکس کہیں کہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کی نظمیں آدھی رات اور پرچھائیاں ، بہت زیادہ مقبول رہی ہیں۔ فراق کی نظم جگنو کا موضوع ایک بچہ ہے جسے یہ بتایا جاتا ہے کہ جگنو مرے ہوئے انسان کی روح کو راستہ دکھاتے ہیں۔ بچہ یہ سوچتا ہے کہ کاش وہ بھی جگنو ہوتا تو اپنی ماں کی بھٹکتی ہوئی روح کو راہ دکھاتا۔ بچے کو جب

شعور آتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ باتیں محض خود فریبی ہیں اور جگنو کو دیکھ کر اس بچے کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ دھرتی کی کروٹ مزدوروں اور کسانوں کے حالات پر بہترین نظم ہے۔ داستانِ آدم اس دنیا پر بسنے والے انسان کی کہانی ہے۔ انسان کے آغاز سے اب تک کی تاریخ کو اس نظم میں سمیٹ لیا گیا ہے۔ فراق کی نظموں کا کینوس بہت وسیع ہے۔

فراق کی نظر میں بڑا شاعر وہ ہوتا ہے جو کسی علم وفلسفہ، سائنس یا مذہب کا پیرو کار نہ ہو بلکہ اس کی شاعری کا محور عام انسانوں کے محسوسات ہوں۔ ان کی آرزوئیں اور تمنائیں ہوں، ان کے آنسو اور ہنسی ہو، زندگی کے دکھ سکھ ہوں اور مناظر قدرت سے گہری ہم آہنگی ہو۔ اس طور پر اگر دیکھا جائے تو فراق کی شاعری بھی عالم انسانیت کی بقا کی بات کرتی ہے، انسانوں کی دکھ سکھ کی بات کرتی ہے اور ان کی نظموں میں مناظر فطرت کی خوبصورت عکاسی بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کی نظم ہنڈولہ میں فراق کی بچپن اور جوانی کے حالات اور اس دور کے ہندوستان کو دیکھا جا سکتا ہے۔ فراق کی نظم آدھی رات میں فطرت کی صناعی کو رات کے اندھیرے میں شاعر کس طرح دیکھتا اور محسوس کرتا ہے، یہ دکھایا گیا ہے۔ نظم پرچھائیاں میں زندگی، کائنات اور فطرت کے خوبصورت رشتوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ فراق کی نظم "جدائی" ملاحظہ ہوں:

شجر حجر پہ ہیں غم کی گھٹائیں چھائی ہوئی　　سبک خرام ہواوں کو نیند آئی ہوئی
یہ خستہ حالی یہ در ماندگی یہ سناٹا　　فضائے نیم شبی بھی ہے سنسنائی ہوئی
دھواں دھواں سے مناظر ہیں شبنمسان کے　　سیاہ رات کی زلفیں ہیں رسمسائی ہوئی
یہ رانگ تاروں بھری رات کے تنفس کا　　کہ بوئے درد میں ہر سانس ہے بسائی ہوئی
خنک اداس فضاوں کی آنکھوں میں آنسو　　ترے فراق کی یہ ٹیس ہے اٹھائی ہوئی
سکوت نیم شبی گہرا ہوتا جاتا ہے　　رگیں ہیں سینہ ہستی کی تلملائی ہوئی
ہے آج سازنواہائے خونچکاں اے دوست　　حیات تیری جدائی کی چوٹ کھائی ہوئی
مری ان آنکھوں سے اب نیند پردہ کرتی ہے　　جو تیرے پنجہ رنگیں کی تھیں جگائی ہوئی
لٹک وہ گیسوؤں کی جیسے پیچ وتاب کمند　　لچک بھوؤں کی وہ جیسے کماں جھکائی ہوئی
سحر کا جیسے تبسم دمک وہ ماتھے کی　　کرن سہاگ کی بندی کی لہلہائی ہوئی
وہ انکھڑیوں کا فسوں روپ کی وہ دیوئیت　　وہ سینہ روح نمو جس میں کمنمائی ہوئی
وہ سیج سانس کی خوشبو کو جس پہ نیند آئے　　وہ قد گلاب کی اک شاخ لہلہائی ہوئی

وہ جھلملاتے ستارے ترے پسینے کے
جبین شام جوانی تھی جگمائی ہوئی

ہو جیسے بت کدہ آذر کا بول اٹھنے کو
وہ کوئی بات سی گویا لبوں تک آئی ہوئی

وہ دھج وہ دلبری وہ کام روپ آنکھوں کا
سجل اداؤں میں وہ راگنی رچائی ہوئی

ہو خواب گاہ میں شعلوں کی کروٹیں دم صبح
وہ بھیروی تری بیداریوں کی گائی ہوئی

لگی جو تیرے تصور کے نرم شعلوں سے
حیات عشق سے اس آنچ کی تپائی ہوئی

ہنوز وقت کے کانوں میں چھچھاہٹ ہے
وہ چاپ تیرے قدم کی سنی سنائی ہوئی

ہنوز سینہء ماضی میں جگمگاہٹ ہے
دمکتے روپ کی دیپاولی جلائی ہوئی

لہو میں ڈوبی امنگوں کی موت روک ذرا
حریم دل میں چلی آتی ہے ڈھائی ہوئی

رہے گی یاد جواں بیوگی محبت کی
سہاگ رات کی وہ چوڑیاں بڑھائی ہوئی

یہ مری پہلی محبت نہ تھی مگر اے دوست
ابھر گئی ہیں وہ چوٹیں دبی دبائی ہوئی

سپردگی و خلوص نہاں کے پردے میں
جو تیری نرم نگاہی کی تھی بٹھائی ہوئی

اٹھا چکا ہوں میں پہلے بھی ہجر کے صدمے
وہ سانس دکھتی ہوئی آنکھ ڈبڈبائی ہوئی

یہ حادثہ ہے عجب تجھ کو پا کے کھو دینا
یہ سانحہ ہے غضب تیری یاد آئی ہوئی

عجیب دور سے کوئی پکارتا ہے تجھے
گلا رندھا ہوا آواز تھرتھرائی ہوئی

کہاں ہے آج تو اے رنگ و نور کی دیوی
اندھیری ہے مری دنیا لٹی لٹائی ہوئی

پہنچ سکے گی بھی تجھ تک مری نوائے فراقؔ
جو کائنات کے اشکوں میں ہے نہائی ہوئی

فراق گورکھپوری کی نظم جدائی کا تجزیہ:

فراق کی یہ نظم ان کی دوسری نظموں کی طرح ہی ہے اور اس میں فطرت کا بے پناہ حسن اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔ یہ نظم فراق نے اپنی محبوبہ کی یاد میں لکھی تھی جو جوانی میں چل بسی تھیں۔تسکینہ فاضل اس نظم کے حوالے سے لکھتی ہیں:

''یہ نظم جو غزل کے انداز میں ہے کئی الفاظ اور تراکیب کے اعتبار سے ہندوستانی ماحول اور فضا کی حامل ہے۔ یہ دراصل فراق کی محبوبہ کا مرثیہ ہے جو جوانی میں اسے داغ مفارقت دے گئی تھی۔اس بنا پر شاعر کے نزدیک ہر شجر پر غم کی گھٹائیں چھا گئی ہیں۔تاروں کے تنفس میں بھی بوئے درد ہے۔ آنکھیں نیند سے پردہ کرتی ہیں۔زندگی میں اس کا تبسم حیات بخش تھا۔ماتھے کی دمک کرن سہاگ کی

بند تھی۔ انکھڑیاں جادو گر اور روپ کی ملکوتیت تھی۔ (بحوالہ، ڈاکٹر تسکینہ فاضل ،فراق گورکھپوری ، حیات، شخصیت اور کارنامے، جنوری 2001۔ص 394)

جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا کہ یہ نظم کسی اپنے کو کھو دینے کے غم و اندوہ پر مبنی ہے۔ نظم کی شروعات میں شاعر کہتا ہے کہ درختوں اور پتھروں پر بھی غم کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں اور تیز چلنے والی ہوائیں بھی آج دھیمی چل رہی ہیں، ایسا لگتا ہے جیسے انھیں بھی نیندائی ہوئی ہو۔ آدھی رات کا وقت ہے اور یہ بے چینی اور بے قراری، عجیب سا سناٹا ہے، فضا پر خاموشی طاری ہے۔ دھند ھلے دھند لے سے مناظر ہیں اور شبنم گری ہوئی ہے۔ اندھیری رات ہے اور ہر طرف ایک عجیب سی خوشبو پھیلی ہے۔ آسمان میں تارے بھی ہیں لیکن اس زمین پر ہر سانس میں درد ہے۔ سرد اداس فضا کی انکھوں میں بھی انسو اور یہ انسو یہ درد تیرے جانے کے وجہ سے ہے۔ تجھے کھونے کی وجہ سے ہے اور یہ جدائی کا احساس مزید گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ میری زندگی تیری جدائی سے زخمی ہے اور میری آنکھ نیند نہیں بلکہ انسووں کا بسیرا ہے۔ تیری مسکراہٹ سے مجھے خوشی ملتی تھی فراق نے اپنے محبوبہ کے نین و نقش کی بھی خوب تعریفیں کی ہیں۔ محبوبہ کے بالوں کمند سے اور بھووں کی لچک کو کمان سے تعبیر کیا ہے۔ پیشانی کی چمک کو صبح صادق کو سورج کی پہلی کرن بتایا ہے۔ آنکھوں میں ایک جادو ہے۔ قد ایسا ہے جیسے گلاب کا پودا ہو۔ پسینے کی بوندیں جھلملاتے ستاروں کی طرح ہیں۔ محبوبہ کو فراق نے کسی دیوی کا روپ دے دیا ہے۔ آگے کی مصروں میں فراق نے اپنی محبوبہ کی آنکھوں، قدموں کی چاپ، دمکتے روپ، انداز گفتگو کو بیان کیا ہے اور کہتے ہیں کہ جوان بیوگی کی محبت مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ لیکن یہ چوٹ اور کھونے کا احساس تم سے بچھڑنے کے بعد زیادہ گہرا ہو گیا ہے۔ تجھے پا کر کھو دینے کا حادثہ عجیب ہے اور میں اسے بھول نہیں پاتا۔ جب بھی یاد کرتا ہوں، میرا چہرہ آنسووؤں سے تر ہو جاتا ہے اور گلا رندھ جاتا ہے اور آواز تھرتھرانے لگتی ہے۔ میری دنیا تیرے جانے سے اندھیری ہے اور مجھے نہیں پتا کی میری آواز بھی تجھ تک پہنچ بھی پاتی ہو گی جو آنسوؤں میں تر ہے اور دکھ بھرے آواز میں تجھے دیتا رہتا ہوں رنگ و نور کی دیوی تو کہاں چلی گئی میری دنیا ترے جانے سے اندھیری ہے اور لٹ چکی ہے۔

☆☆☆

Sa-adat Hasan Manto aur Rediyayi Drame by Mohd. Yusuf Mir

(Doda) cell-8082004155

محمد یوسف میر (ڈوڈہ)

سعادت حسن منٹو اور ریڈیائی ڈرامے

ریڈیو ڈرامے کے فروغ میں جن ترقی پسند مصنفین نے اپنا خون جگر صرف کیا ان میں سعادت حسن منٹو کا نام بھی سرفہرست ہے۔ سعادت حسن منٹو 11 مئی 1912ء میں موضع سمرالہ ضلع لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام خواجہ غلام حسین تھا۔ جو خود بھی ایک مصنف تھے منٹو نے ابتداء میں عربی، فارسی اور انگریزی کی تعلیم گھر میں ہی حاصل کی۔ ۱۹۳۱ء میں امرتسر کے مسلم ہائی اسکول شریف پورہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ منٹو کو بچپن سے ہی اردو ادب سے کافی لگاؤ رہا ہے۔ انہوں نے ترقی پسند تحریک سے کبھی کوئی تعلق استوار نہیں کیا۔ لیکن کبھی اس تحریک کی بُرائی بھی نہیں کی۔ ترقی پسند تحریک سے دور رہ کر بھی حقیقت نگاری کو ہی اپنی تخلیقات میں برتا۔ ہے۔ منٹو نے اپنی زندگی کا آغاز ناول سے کیا۔ سعادت حسن منٹو نے بیک وقت افسانے، ناول، ڈرامے، خاکے، مضامین، خطوط، فلم اسکرپٹ اور مکالمہ تحریر کیے ہیں۔ لیکن اُردو ادب میں ان کی زیادہ تر شہرت افسانوں اور ڈراموں میں ہوئی۔ انہوں نے ریڈیو کے لئے بہت ڈرامے لکھے جو آل انڈیا ریڈیو دہلی اور ہندوستان کے دیگر ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہوئے اور آج بھی وقتاً فوقتاً نشر کیے جاتے ہیں۔ منٹو نے ریڈیائی ڈراموں اور فیچرز سے متعلق اظہار کرتے ہوئے اپنے ریڈیائی ڈراموں کے مجموعے ''نیلی رگیں'' میں یوں لکھا ہے۔

''میں اس وقت تک سو سے اوپر ریڈیائی فیچرز اور ڈرامے لکھ چکا ہوں۔ جو آل انڈیا ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں سے براڈ کاسٹ ہو چکے ہیں۔"

چوں کہ ادب کو زندگی سے قریب تر لانا ہی ترقی پسند تحریک مصنفین کا بنیادی مقصد تھا اور اس لحاظ سے منٹو کے ڈرامے اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ سیاسی، سماجی اور عصری مسائل ہمیشہ ہی سعادت حسن منٹو کے ریڈیائی ڈراموں کا موضوع رہا ہے۔ موجودہ دور تک ان کے جو ریڈیائی فیچرز اور ڈراموں کے مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ وہ اس طرح سے ہیں۔

(۱) آؤ (۲) ''نیلی رگیں''، (۳) جنازے، (۴) تین عورتیں (۵) افسانے اور ڈرامے (۲) کروٹ
ا۔آؤ۔سعادت حسن منٹو کے دس ریڈیائی فیچرس پر مشتمل مجموعہ ہے۔اس مجموعہ کو منٹو نے ملازمت کے دوران لکھا اور اس میں ریڈیو کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا۔منٹو کا ریڈیائی فیچرز پر مشتمل مجموعہ ''آؤ'' سیریل کی حیثیت رکھتا ہے۔جس میں انھوں نے نچلے طبقے کے لوگوں کے روزمرہ کی زندگی کے واقعات کو ایک دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔منٹو نے اس سیریل میں موجود کردار کشور، لاجونتی اور نرائن پر فیچر میں موجود ہیں۔جن کے ذریعہ عمل کا باہمی مظاہرہ بڑی مہارت کے ساتھ کیا ہے۔

منٹو نے حقیقت نگاری کو مدنظر رکھتے ہوئے عام انسان کی گھریلو زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ڈراموں سے متعلق سعادت حسن منٹو کا دوسرا مجموعہ" نیلی رگیں "ہے۔جو پہلی بار ۱۹۴۵ء میں نیا ادارہ لاہور سے شائع ہوا۔جب کہ دوسری دفعہ ساقی بک ڈپو نے ۱۹۸۶ء میں اس کو شائع کیا۔اس مجموعے میں ڈراموں کی تعداد اٹھارہ ہے۔جن کے نام حسب ذیل ہیں۔

نیلی رگیں، کبوتری، انتظار، انتظار کا دوسرا رخ، کمرہ نمبر 19، ٹیڑھی لکیر، جیب کترا، عید کارڈ، اکیلی، جرنلسٹ، ساڑھی، نقش فریادی، بیمار، جرم وسزا، کیا میں اندر آسکتا ہوں، تحفہ، سلیما اور ہتک ہیں۔

ڈرامہ ''نیلی رگیں'' میں سعادت حسن منٹو نے سعید جو کہ ایک شاعر ہے کہ ذریعے خیال، رومان اور نفسیات کی بہترین عکاسی کی ہے۔سعید کا مرکزی کردار ہے جب کہ کرشن اس کا دوست ہے۔سعید اپنی تصوراتی دنیا میں کھو کر ایک خوبصورت لڑکی کو اپنی تصور میں لاتا ہے جو سرد موسم کی وجہ سے اور اپنے گورے اور نازک ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھمائی ہے۔

سعید کا یہ تصور اس وقت حقیقت کا رنگ استوار کرتا ہے جب وہ لڑکی ثریا کی شکل میں اس کے سامنے آتی ہے۔سعادت حسن منٹو کا یہ ایک رومانی ڈراما ہے۔مکالمہ نگاری کے حوالے سے بھی یہ ڈراما کافی اہمیت رکھتا ہے۔ملاحظہ ہو چند مکالمے:

''ثریا: میں بہک رہی ہوں"
سعید: تمہاری زندگی نیا لباس پہن رہی ہے
ثریا: اُف میرے ہاتھ کتنے ٹھنڈے ہیں
سعید: میرے ہاتھ میں دے دو۔
جوانی کے خیالوں کی سی گرمی تم ان میں پاؤ گی۔''

''جنازے''سعادت حسن منٹو کا ایک اور فیچرز کا مجموعہ ہے جو پہلی بار ۱۹۴۲ء میں ظفر برادرز لاہور کی

جانب سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ جبکہ اس مجموعے کو دوسری بار ساقی بک ڈپو نے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا۔منٹو کے اس مجموعے میں نو ریڈیو فیچرز شامل ہیں۔جن کی فہرست یوں ہے۔

چنگیزی کی موت
تیموری کی موت
قلوپطرہ کی موت
نپولین کی موت
بابر کی موت
شاہ جہاں کی موت
ٹیپو کی موت
داس پوٹین کے موت
منٹو کی موت

سعادت حسن منٹو کا یہ مجموعہ اعلی فیچر نگاری کا ایک بہترین نمونہ ہے اس میں منٹو نے دنیا کی اعلی پایہ شخصیت کی زندگی کے آخری وقت کی نقاب کشائی کر کے تاریخ کی دنیا میں ایک اہم اضافہ کیا ہے۔

مجموعہ ''تین عورتیں'' میں سعادت حسن منٹو کے پانچ ڈرامے شامل ہیں۔ پہلی مرتبہ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا جبکہ دوسری مرتبہ ۱۹۵۳ء اور تیسری بار ۱۹۵۶ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ منٹو نے اس مجموعے میں عورتوں کی نفسیات کا مشاہدہ بڑی کامیابی کے ساتھ کیا ہے ان ڈراموں میں موجود تین صورتوں کا خلوص، خدو خال، عادات و اطوار اور ان کا رہن سہن ان کے ظاہر سے بالکل الگ ہے مثال اگر دیکھا جائے تو تین صلح پسند عورتیں صلح پسند ہیں اور نہ ہی تین بیمار عورتیں بیمار سی ہیں اور نہ ہی تین موٹی اور خاموش ہیں بلکہ منٹو نے ان تینوں عورتوں کے باطن اور ظاہر کو اُجاگر کیا ہے۔منٹو کا یہ مجموعہ فکر و فن کے اعتبار سے نہایت ہی قابل اعتماد ہے ایک مرد اور دو ہزار سال بعد منٹو کے اہم اسٹیج ڈراموں میں شمار ہوتے ہیں۔

مجموعہ کروٹ میں شامل ڈراما " کروٹ ''منٹو کی فکر و فن کا بہترین نمونہ ہے ۔جو ریڈیو ڈرامے کی دنیا میں اپنی مثال آپ ہیں ۔سردار حسن منٹو کے ڈراموں کا ایک مجموعہ کروٹ ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا اس مجموعہ کے ڈراموں میں حسب ذیل ڈرامے شامل ہیں۔کروٹ، خودکشی، ماچس کی ڈبیا، رندھی پہلوان، محبت کی پیدائش، چوڑیاں، روح کا ناٹک شامل ہیں۔ان مجموعوں کے

علاوہ بھی منٹو نے کئی دیگر ریڈیو ڈرامے اور فیچرز لکھے جو وقتاً فوقتاً ریڈیو سے نشر ہوتے ہیں۔فنی نقطہ نظر سے سعادت حسن منٹو کے ریڈیائی ڈرامے، ریڈیو ڈرامے کے فروغ میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ انہوں نے جو اپنے ڈراموں میں لکھا۔ ہے۔ وہ حقیقت پسندی اور واقفیت نگاری کی ایک کامیاب مثال ہے۔

سیاسی ،سماجی ، معاشی وعصری مسائل ان کے ڈراموں کا خاص موضوع رہا ہے۔انہوں نے اپنے ڈراموں میں جن لوگوں کو پیش کیا وہ تخیلی دنیا میں وابستہ لوگ نہیں بلکہ یہ سب حقیقی زندگی سے سروکار رکھنے والے ہیں۔ ان کے ڈراموں کے کرداروں میں حقیقت کا رنگ صاف طور پر نظر آتا ہے۔ پلاٹ کردار، ایجاز، اختصار جیسی خصوصیات سے ان کے ڈرامے پرُ ہیں۔ کیوں کہ منٹو نے اپنی زندگی کے کئی سال ریڈیو کی ملازمت میں گزارے تھے۔ عام انسان کی بنیادی ضرورت کیا ہے ان سب سے اچھے سے واقف تھے۔

ان کے ڈرامے آغاز ، درمیان اور اختتام جیسی منازل سے کامیابی کے ساتھ گزارتے ہیں۔انہوں نے ریڈیو کے لئے لاتعداد کامیاب ڈرامے لکھ کر ریڈیو میں ایک اہم اور قابل داد اضافہ کیا ہے۔

☆☆☆